جلد ۱۱۱ اپریل ۱۹۸۹ء عدد ۲

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۱۱ | اپریل ۱۹۸۹ء مطابق رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ | عدد ۲

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵- اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

رابطہ کے لیے: ادارہ ترجمان القرآن، رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

فون نمبر —— ۳۲۴۴۶۸

زر سالانہ تیس روپے - فی پرچہ ۳/ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

اقبال — رمضان — جہادِ افغانستان

احیائے اسلام کے نقیب حکیم الاُمت اقبال کا یومِ وفات سامنے ہے۔ مگر ایسے مردانِ جلیل کے لیے موت کوئی معنی ہی نہیں رکھتی، وہ تو اپنے کلام اور پیام سے پھیلنے والی شعاعوں کی رُوح بن کر زندہ تر ہو جاتے ہیں۔

اقبال اوّلاً رجالِ فن میں سے ایک ایسی درخشاں شخصیت ہے جس نے شعر کو تخیل کی نزاکتوں اور احساس کی لطافتوں اور فکر کی بوقلمونیوں سے ایسے نظر فریب جمال سے آراستہ کیا اور اُردو کے گیسو ایسے کمال سے سنوارے کہ بڑی اعلیٰ درجے کی سابق مثالیں پیچھے رہ گئیں۔ اور نئی ذہانتوں اور ندرتوں اور جدتوں کے چراغ ضو فشاں نہ ہو سکے۔

مگر اقبال نے شاعری کو سامانِ تفریح و طرب بنانے کے بجائے اپنی نوائے ہائے سخن سے غلامی کے پسے ہوئے نوجوانوں میں ایمانِ خفتہ کو بیدار کیا اور ان کے ہاتھوں میں خودی کی تلوار دی، جو عشق کی سان چڑھنے کی وجہ سے قاطعِ باطل ٹھہری۔

اقبال کی یاد آئی تو تشکیلِ پاکستان کے خواب کی تعبیر کا وہ لمحہ قائداعظمؒ کی قیادت میں سامنے آیا جو، ۲۷ رمضان المبارک کی لیلۃ القدر میں رکھا گیا تھا۔ اور آج وہی رمضان المبارک گھوم کر پھر اپنی برکتوں کے ساتھ سامنے ہے۔

اور اقبالؒ نے سکندر اور نادر کے حملوں کا ذکر کر کے کہا تھا کہ:

؎ افغان باقی! کہسار باقی! اَلْحُکْمُ لِلّٰہ! اَلْمُلْکُ لِلّٰہ!

اس پیش گوئی کی تکمیل بھی آج ہو رہی ہے جب کہ سکندر اور نادر سے کئی گنا بڑی اور پھر اسلام دشمن اور انسان دشمن قوت سید جمال الدین افغانی کے افغانستان میں آگ اور خون کے طوفان اٹھانے کے بعد چٹانوں سے سر ٹکرا ٹکرا کر اپنی شکست کا تاج پہنے، اسی حسرتِ خون چکاں کے ساتھ رخصت ہو گئی ہے جس کی جھلک شام کو چھوڑ کر قسطنطنیہ جاتے ہوئے قیصر کی آخری نگاہوں میں تھی۔

ہو سکتا ہے کہ جس اسلامی حکومت کی سعادتیں سامنے لانے کے نصب العین میں (باقی بر صفحہ ۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(گزشتہ سے پیوستہ)

تلافیٔ مافات اور بحالیٔ رفتارِ عمل کے لیے چند مزید توجہ طلب امور عرض ہیں۔

دعوت اور انقلابی تحریک برائے اقامتِ دین کا کام کرنے والے افراد اور گروہوں کے لیے ایک لازمی شرط استقامت ہے۔ استقامت کے معنی اتنے ہی نہیں کہ ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت (و آخرت) کے موقف سے آدمی کسی ظلم اور دباؤ اور لالچ کے باوجود نہ ہٹے۔ بلکہ وسیع تر مفہوم یہ ہے کہ نظامِ اسلام کے تمام اصول و مقاصد اور اخلاقی اقدار اور تہذیبی شعائر منہج انقلاب اسلامی

(بقیہ صفحہ ۲)

پاکستان پیچھے رہ گیا ہے، اِس فریضہ کی ادائی میں مجاہدینِ افغانستان آگے نکل جائیں۔ اَللّٰھُمَّ انْصُرْھُمْ۔

ہوسکتا ہے کہ پاکستان سے لے کر ترکیہ تک ایک نیا سلسلۂ قوت نمودار ہو جائے۔

کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں

اور اقبال کی یاد آئی تو غازی علم الدین شہید کی بھی یاد آئی، کیونکہ سلمان رشدی کی خرافات نے مسلمانوں کے جہانِ ایمان و جذبہ کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ اقبالؒ، قائدِ اعظم، سید جمال الدین افغانی، غازی علم الدین شہید اور شہدائے مجاہدینِ افغانستان (برائے قیامِ حکومتِ اسلامی) سب پر خصوصی رحمتیں اور مغفرتیں فرمائے

کے ثابت و واضح ضوابط اور سماجی زندگی کے لیے اختیار کردہ معتدل و متوازن موقف کی دانتوں تک کا زور لگا کر حفاظت کی جائے۔ اگرچہ ہر طرف سے تاریکیوں کا سیلاب اُمڈا چلا آ رہا ہو، اگرچہ تعیشات و تفریحات اور اسبابِ تفاخر نے گھیرا ڈال رکھا ہو! اگرچہ معاشی و سماجی و ثقافتی ملحول (جس کی طنابیں دشمنِ اسلام تہذیب کے ہاتھوں میں ہیں) ہمیں ہر طرف سے بھینچ رہا ہو، اگرچہ نظامِ باطل کی قبریں پڑے ہوئے ہر انسان کو حرام کی کھلی کھڑکی میں سے سرابِ گل و لالہ کے جلوے کھینچ رہے ہوں۔ ایک بار جو شخص سوچ سمجھ کر صبغۃ اللہ کو اختیار کر لے، پھر نہ وہ اس رنگ کو بدلے، نہ مدھم پڑنے دے۔ بڑے بڑے نیک لوگ صبغۃ اللہ کا تحفظ کرنے میں کوتاہ رہ جاتے ہیں۔

استقامت میں خلل اس وجہ سے بھی آتا ہے کہ بسا اوقات سالکِ جادۂ دعوتِ انقلاب یہ سمجھتا ہے کہ اُصول و مقاصد اور روایات و اقدار کے بنے بنائے سیدھے راستے سے تھوڑا ہٹ کر ایک گھماؤ کو طے کرنے کا پروگرام خود دعوت اور تحریک ہی کو کسی اور طریقے سے فائدہ پہنچائے گا۔ کارکن یہ سوچتے ہیں کہ ہم اہلِ خانہ، برادری، احباب اور مخالفین کے درمیان کسی ایک نقطے پر ڈٹ کر کھڑے ہونے اور اعتراضات و استہزا کا مقابلہ کرتے رہنے کے بجائے تھوڑا سا تغیر اپنے مقام اور رویے اور ہیئت میں کر لیں تو پھر شاید "فتوحات" کا سلسلہ بڑھ جائے گا۔

خدا کے پیغمبروں نے تو مخالفین کی طرف سے اس طرح کی سودا بازیوں کو جو بسا اوقات بڑی مخلصانہ اور معصومانہ دکھائی دیتی تھیں، وحیٔ الٰہی کے ماتحت صاف صاف ٹھکرا دیا تھا۔ اس طرح کی سودا بازیوں کے خوگر صلاحیتِ انقلاب کو کھو بیٹھتے ہیں۔ اسلام کوئی سیل ڈپو نہیں ہے کہ جب جو چیز چاہی خرید کر ڈال لی، جب جس چیز کو چاہا بیچ دیا۔ اور اس خرید و فروخت میں اچھائی کو بُرائی سے الگ الگ چھانٹ پرکھ کر لینے دینے کے بجائے زیادہ تر سوداگری بڑی بُرائی اور چھوٹی بُرائی میں شروع کر دی۔ یہ فارمولا محض شاذ و نادر موقعوں پر اُصولی اُمور سے نیچے کے معاملات میں استعمال ہوتا ہے، یہ خود کوئی اُصول نہیں ہے کہ ہر جگہ کھل کر اس کا استعمال کیا جانے لگے۔ اس اُصول کو مستقل اوڑھ لینے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ کسی نہ کسی وقت ہر بُرائی اختیار کی جانے لگتی ہے جب کہ اس کے مقابل میں کوئی بڑی بُرائی موجود ہو۔ اور ہر چھوٹی بُرائی کے سامنے بڑی

بُرائی موجود ہوتی ہی ہے ۔

استقامت کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ کسی اصول یا نظریہ یا تحریک یا جماعت کا تشخص جو اوّل روز طے ہوا تھا اور جس کی تشکیل اور جس کے اظہار اور جس کی حفاظت پر لمبی محنتیں صرف ہوتی ہیں ، وہ کئی سال گذر جانے پر بھی جُوں کا تُوں رہے ۔ اس کی جو قدر و قیمت اپنوں اور بیگانوں کی نگاہوں میں قرار پائی تھی وہ برقرار رہے ۔ اُس نے جس چہرے کے ساتھ افقِ تاریخ پر پہلے دن جلوہ نمائی کی تھی، اس کے سارے خدوخال باقی رہیں اور کوئی جزء مسخ نہ ہونے پائے ۔ لوگ جس چیز کو عام معاملات میں ناک بچانا کہتے ہیں، سیاسی اور تحریکی اور دعوتی دائروں میں اس کا برتر تصوّر "تشخص" یا "چہرے" کو بچانے کا ہے ۔

خارج میں جو چیز چہرے کی تشکیل کرتی ہے، باطن میں وہی مزاج (صبغۃ اللہ) بناتی ہے ۔ تحریکوں اور جماعتوں کی سلامتی اور برقراری اور ترقی اسی میں ہے کہ وہ اپنے چہرے اور اپنے مزاج (تشخص) کو بچائیں اور بچائے رکھیں ۔ ایمان سے لے کر تشخص و مزاج تک "استقامت" کے تقاضے پھیلے ہوئے ہیں ۔

اب پڑھیے: اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا ...... الخ

رب کو رب کہہ دینا آسان ، اس کی ہدایت کو قبول کر لینا مشکل ، مگر حتمی عزم کر لیا جائے تو یہ بھی ممکن ! لیکن اس ہدایت کے ہر اصول اور اس کی ہر قدر پر چند روز یا چند ماہ کے لیے نہیں ساری عمر کے لیے جمے رہنا انتہائی کٹھن ۔ اور جمے رہنے والوں کے لیے ماحول کے ظلم و جبر کے زیر اثر امتحان کی اس منزل کو پار کر لینا اور بھی کپکپا دینے والا ہے جسے قرآن نے " حَتّٰى زُلْزِلُوْا " کے الفاظ سے ہماری نگاہِ تصور کے سامنے رکھا ہے ۔ اس راستے میں جب کوئی مشکل موقع آئے تو آپ "چھوٹی بُرائی" کی پناہ گاہ تلاش کرنے لگیں تو پھر آخری مقامِ امتحان تک پہنچنے اور اور اس کی سعادتیں اور برکتیں سمیٹنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

مولانا مودودیؒ نے کہا تھا کہ ہمیں ایسے کارکن چاہییں جو نہ بکیں، نہ دبیں اور نہ جھکیں ۔ اگر آپ معاشرے کی منڈیوں میں انسانوں کے بکنے کے لطیف طریقے مشاہدہ کریں اور اسی طرح دبنے اور جھکنے کے نرالے ڈھنگ دیکھیں تو آپ سوچ میں پڑ جائیں ۔ مثلاً ایک طرف ایک کاروباری مفاد

ہے اور دوسری طرف تحریک کی خدمت، آپ گذر بسر کی معاش سے اوپر جاتے کے لیے اپنے اصولوں اور اخلاقیات کی نئی تعبیریں اختیار کر لیتے ہیں۔ یا ماحول کے سامنے دبنے اور رواجوں کے سامنے جھکنے کے لیے یہ دلیل پیدا کر لیتے ہیں کہ ہم پورے معاشرے کے مجموعی حالات سے تو ہم الگ نہیں ہو سکتے تو پھر کہاں رہی وہ بات کہ "نہ بِکیں، نہ دبیں اور نہ جھکیں"

یارانِ طریق! قرآن کا یہ ایک اصطلاحی اور انقلابی لفظ استقامت بڑی ہی بھاری ذمہ داریاں آپ پر لادتا ہے۔ کیا آپ نے ان ذمہ داریوں کو سمجھا؟ اور کیا ان کو پورا کرنے پر تیار ہیں؟

یہ بات بھی دعوت ہی کے تحت آتی ہے کہ ہمیں ہر ممکن بصیرت مندانہ کوشش کر کے علماء مشائخ اور دینی جماعتوں اور ان کے مدرسوں اور اداروں اور جرائد و مطبوعات کو اس مقصد کے لیے متحد کر دینا چاہیے کہ وہ الحاد، دہریت اور لادینیت اور منکرات و فواحش کے خلاف اپنے اپنے اپنے طریقوں سے جہاد کریں اور دینِ برحق کے علو کے لیے خون پسینہ ایک کر دیں گے۔

موجودہ حالت بڑی افسوس ناک ہے کہ دینی گروہ اور علماء و مشائخ اور اسلامی حلقوں سے نسبت رکھنے والی شخصیتیں الگ الگ کیمپ لگا کر افکار و نظریات پیش کر رہے ہیں اور ہر کوئی اپنی روش جداگانہ اختیار کر لیتا ہے۔ ایک آواز آئے گی کہ فلاں چیز اسلام میں ضروری ہے۔ دوسری طرف سے صدا بلند ہوگی کہ وہ ہرگز ضروری نہیں ہے۔ ایک کہے گا کہ آٹھویں ترمیم کو اڑا دینا چاہیے، دوسرا کہے گا بالکل برقرار رکھنا چاہیے، تیسری آواز یہ بھی؟ ہے گی کہ اس کے تمام اجزا کو الگ الگ لے کے دیکھنا چاہیے کہ کس کو ختم کرنا ضروری ہے۔ عورت کی سربراہی کا مسئلہ ہو، جمہوریت پر بحث چھڑے، حدود کے مقدمات میں عورت کی شہادت کی نزاع ہو یا سود کا مسئلہ، بلکہ شب برات اور بسنت اور ختنے تک پر بحثیں چھڑ جائیں گی۔ یعنی بابل والی صورت۔ پھر سیاست میں آئیں گے تو کوئی کسی ایک پارٹی کے ساتھ، کوئی دوسری جماعت کے ہمراہ۔ کوئی سب سے الگ تھلگ، کوئی تمام دینی اور سیاسی عناصر کے خلاف۔ اس چیز نے نہ صرف دینی حلقوں کے وقار و وقعت کو کم کیا ہے بلکہ خود دینِ اسلام کے خلاف بدظنی پھیلانے والوں کے ہاتھ مضبوط کیے ہیں۔ اب حد یہ ہے

کہ دینی شخصیتوں اور ان کے سیاسی دھڑوں کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ انہیں کوئی بھی ساتھ لے سکتا ہے، نیز بالعموم ان کے خلاف تضحیک و استہزا کے ہتھیار استعمال کیے جاتے ہیں۔

ذرا بغور ملاحظہ فرمائیے کہ ہمارے معزز و مکرم دینی اصحاب کے جرائد میں کس طرح بحثوں اور کج بحثیوں کے چکر چلتے ہیں۔ مثلاً میں نے ایک ہی فرقے کے اصحاب کے دو گروہوں کی بحثیں پڑھیں۔ ایک دوسرے کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ "او مولوی صاحب! کچھ خدا کا خوف کرو، کیوں مسئلے گھڑتے ہوتے ہو"۔ دوسرا کہتا ہے کہ "آپ جیسے لوگ سراپا جہالت ہو کر دین کے نام سے جھوٹ بولتے ہیں"۔ (میری یادداشت میں ترتیبِ الفاظ شاید کچھ مختلف ہوگئی ہو)

سچائی کو مسخ کرنے کی صورتیں، سچائی سے غلط نتائج نکالنے کے اسلوب اور دین کی حقیقتوں میں سے کسی بھی اکائی کے دو ٹکڑے کر کے ان کو لڑا دینا، اپنے قدامت پسندانہ ذوق کے تحجر کی وجہ سے ۱۵ ویں صدی ہجری کے مسائل کو پہلی صدی ہجری کی فضا میں رکھ کر سوچنا، یا اپنے بوسیدہ تشخص سے پیدا ہونے والے احساسِ کہتری کے ردعمل میں تجارت طرازوں کو مات کر دینے کے شوق میں ان سے بڑھ بڑھ کر قدم مارنا، یہ بڑے دردناک احوال ہیں۔ اپنے بزرگوں کی باتیں ہیں اور ان باتوں کو چھیڑ کر دل بہت رنجیدہ اور شرمسار ہوتا ہے۔ مگر صلاح و فلاح کے لیے بھی تو بے لاگ تجزیۂ احوال کی ضرورت ہے۔

نہایت اندوہگیں صورتِ حالات کا ایک پہلو ایسا ہے جس کا تعلق ہم سے بھی جا جڑتا ہے۔ یعنی ہم سے اختلاف کر کے جانے والے اصحاب میں سے کچھ تو خاموشی و خلوت کے دائرے میں حسبِ منشا کوئی کام کرتے ہوں گے، کچھ وہ ہیں جنہوں نے ہمیں بھول بھلا کر اپنے ذوق کے مطابق کوئی دینی مشغلہ اختیار کر لیا۔ پھر کچھ وہ تھے جو ایک ہی مرتبہ جاتے جاتے لات مار گئے اور اسی میں ان کا نشہ پورا ہو گیا۔ مگر کچھ اصحاب وہ بھی ہیں جو ہمارے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے کیمپ لگائے ہوئے ہیں۔ ان کے نظریات بھی اسلامی ہیں، مگر اختلافی نظریات میں کہیں کم اور کہیں بہ زور ایک انتقامی زہر بھی شامل ہے۔ یہ زہر انہیں مجبور کرتا ہے کہ دین کی خدمت کرتے کرتے ہمیں بھی ڈنک ضرور لگائیں۔ کوئی قرآن کی تفسیر کرتے کرتے اور کوئی حدیث کی تشریح سامنے لاتے ہوئے اور کوئی فقہی مباحث چھیڑتے ہوئے اس فریضہ سے غافل نہیں ہوتا کہ اپنی علمی یا منتقیانہ گل پاشیوں کے

سامنے تھوڑی سی گلوخ اندازی سے ہمیں مشرف کرتا رہے۔ اور ان سب کے لیے حلقہ مخاطب نہ غیر مسلم ہیں، نہ معاشرے کے بگڑے ہوئے اکابر و عوام، بلکہ اُن کی شکارگاہ ہمارے ہی ہم خیال اور ہم قدم نوجوان ہیں۔ یعنی کیا ہی شاندار تحریکِ افتراق ہے جو چل رہی ہے۔ سب کے "اڈے" اور "اکھاڑے" ہیں جہاں سے دوسروں کو چیلنج دیئے جاتے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کو اُکسانا، چٹکیاں بھرنا، مذاق اُڑانا، فتوے چسپاں کرنا، لوگوں کے ایمانوں کی پیمائش کرنا، نیتوں کی جھلکیاں کاغذ پر لے آنا، کیا ہی شاندار کمالات ہیں۔ سب کے اپنے اپنے جریدے اور رسالے ہیں، جن میں کہیں بہت ہی شائستہ اور کہیں بہت گھٹیا لپاڈگی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ پھر کتابوں کی کتابیں فتنۂ تخریب کے تحت چھپتی ہیں۔ جن کے اوراق مسلمانوں کے درمیان دیواریں کھڑی کر دیتے ہیں۔ ان کتابوں اور رسالوں کے غیر صحت مندانہ پہلو کی وجہ سے عوام کے اخلاق و کردار میں کوئی بہتری پیدا نہیں ہوتی، بلکہ اُلٹا پستی آتی ہے۔ ہر کسی کا دعویٰ کہ ہم سچے ہیں، نیک صرف ہم ہیں اور دین کی صحیح نمائندگی کرنے کا واحد اجارہ ہمارے پاس ہے۔

مسجدوں کے وعظ سُنیئے، جمعوں کے خطبے سُنیئے، میں نے تو شاذ و نادر ہی کبھی کسی جگہ کام کی کوئی بات سُنی، ورنہ روزِ ازل کے قضیئے، نُور کی ماہیت اور تخلیق کے مبدأ اور بزرگوں کی کرامات کی کہانیاں سُنی ہیں۔ چاروں طرف جو اخلاقی خرابیاں اور حرام کمائیاں اور منکرات و فواحش کا طوفان پھیلا ہوا ہے، اس کی طرف طنز و تضحیک کے بجائے دردمندی سے کسی واعظ و خطیب نے بھرپور اور مؤثر توجہ ہی نہیں دلائی۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر ہمارے علماء و مشائخ اور دینی ادارے اور جماعتیں اپنی روش کو بہتر بنالیں اور لادینیت[1] کے خلاف محاذ کی مضبوطی کا اہتمام کریں، نیز ایک دوسرے کے فروعی اختلافات کی بحثا بحثی اور باہمی نشتر زنی اور ناوک اندازی کے مشاغل کو ترک کر کے اپنی ایک مشترک کونسل بنالیں جو اہم دینی و ملی مسائل میں متفقہ ہوئی فیصلہ کُن رائے دے سکے اور افراد اور جماعتوں کے درمیان ہونے والی نزاعات کو بھی حل کر سکے تو پھر یہاں ایک ایسی مؤثر قوت

---

[1] اس گفتگو میں قادیانی، منکرینِ حدیث اور دوسرے مخالفِ اسلام عناصر پیشِ نظر ہیں۔

پیدا ہو سکتی ہے کہ لادینیت کو نہ پروپیگنڈے کے دائرے میں، نہ انتخابات میں اور نہ پارلیمان میں سر اٹھانے کی جرأت ہو سکتی ہے۔ بلکہ الٹا علما کی متحدہ قوت کا اٹھایا ہوا ہر مطالبہ منتخب ممبران اور حکمرانوں کو ماننا پڑے گا۔

اگر مثبت طور پر اتحاد و اتفاق ایک ہی مرحلے میں حاصل نہ ہو سکے تو کم از کم "عدمِ محاربت" کے منفی سمجھوتے پر سب کو جمع کر لیا جائے۔ ضروری نکات یہ ہیں:

۱- علما کی ایک نمائندہ کونسل عالمی اور ملکی حالات پر اس پہلو سے نظر رکھے کہ لادینیت کی علمبردار اور منکرات و فواحش کو فروغ دینے والی قوتیں، نیز مسلمانوں کو ان کے اپنے آزاد ملکوں میں فکری، تعلیمی، ثقافتی، معاشی، ڈپلومیٹک اور سازشی حرکات کیا کیا ہیں اور ان کے خلاف کس طرح مزاحمت کی جائے۔

۲- یہ اصول تسلیم کرتے ہوئے کہ ہر کسی کو اپنے نظریاتی اور فقہی خطوط پر چلنے کا حق ہے، ایک واضح اعلان تمام فرقوں کے علما نشر کریں کہ ہم باوجود اپنے اختلافات کے کفر و الحاد اور منکرات و فواحش کے خلاف متحد ہیں۔

۳- سب کا متفقہ نصب العین خدا کی حاکمیت کے تحت قرآن و سنت کے مطابق قانون سازی اور اسلامی نظامِ خدمت و عدل کا نفاذ ہے۔

۴- بڑے بڑے دینی و شرعی مسائل جب اٹھیں تو بعض صورتوں میں علما کی مقامی کونسلوں کو اور اہم صورتوں میں مرکزی کونسل کو ایک ہی نقطۂ نظر دلائل سے متعین کر دینا چاہیے۔ اختلافی بحثیں کونسلوں کے اندر رہوں۔

مولانا مودودیؒ کے پورے دور میں اس مقصد کے لیے مساعی جاری رہیں جن کے نتیجے میں نو نکاتی مطالبے کی منظوری، بنیادی دستوری اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کا استرداد، ۲۲ دستوری نکات پر کامیاب اتحاد اور بعد ازاں عائلی قوانین اور رویتِ ہلال وغیرہ کے مسائل پر مضبوط موقف، وغیرہ نتائج حاصل ہوئے۔ بعد میں بھی اگرچہ یہ مساعی جاری رہیں اور اب بھی مرکز کی طرف سے ہوتی رہتی ہیں، مگر ضرورت ایک مضبوط منصوبہ بندی کی ہے کہ کیسے لوگ اِن دائروں میں کِن کِن اسالیب سے کام کریں۔ کام کیا، ایک مہم چلا دیں۔

کوئی ذرا سا فتنہ اُٹھے یا دین کے کسی ادنیٰ ترین تقاضے کا معاملہ سامنے آئے، ہماری دعوتی مشینری کو ایک ایک مسجد تک اس کے متعلق ضروری مواد (یا پس منظر وغیرہ) کو پہنچا دینا چاہیے اور پھر علماء سے بات چیت اور استفادے کے لیے ہر جگہ ٹیمیں نکل کھڑی ہوں۔

خیال رہے کہ علماء بڑی مشکل چیز ہیں۔ ان کا بہت ادب کیجیے، ان کی زیادتیاں صبر سے برداشت کیجیے، ان کے معاملے میں سخت محتاط رہیے اور اُن سے ایک مؤدب شاگرد اور سائل کی طرح بات کیجیے۔ ہمیشہ یہ ملحوظ رکھیے کہ اقامتِ دین کا کام کرنے والوں کے لیے یہ قوت بہت ہی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن اگر یہ پراگندہ رہے تو ہمارے لیے نقصانات بھی بہت ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کام اگر ہو جائے تو اس ملک میں ایک بڑا انقلابی قدم ہوگا۔

آج اگر ایسا ہوتا کہ جو دینی قوتیں اور گروہ پارلیمانی سیاست میں آئے ہیں وہ سب کے سب ایک صفِ بے رخنہ میں ہوتے تو وہ ساری ناگوار صورتیں واقع نہ ہو سکتیں جن کی تلخی کو ہم بھگت رہے ہیں، یا جو طرح طرح کی متضاد بحثیں چھڑی ہوئی ہیں۔

سیاسی سرگرمی اور انتخابی جدوجہد بھی ایک دائرۂ دعوت ہے، نیز ذریعۂ اثر اندازی۔ احتیاط صرف یہ لازم ہے کہ سیاسی کام کرتے ہوئے بھی دینی رنگ برقرار رہنا چاہیے، اور دین سے جدا سیاست کا کوئی تصور کارفرما نہیں ہونا چاہیے۔ دین کو اوّلیت حاصل رہے گی تو دینی سیاست نمودار ہوگی اور سیاست غالب رہے گی تو سیاسی دینداری بن جائے گی۔ دین و سیاست کو ایک اکائی کے دو پہلو ہونا چاہیے، جیسے دین اور تعلیم، یا دین اور معیشت وغیرہ۔

دین کے اخلاقی اقدار و شعار جس طرح تمام زندگی میں غالب رہنے چاہئیں، اُسی طرح سیاسی (و انتخابی) سرگرمیوں میں غالب رہنے چاہئیں۔

ووٹروں کا ہجوم جمع کرنا اور ارکان و متفقین بنانا دو الگ الگ کام ہیں۔ انتخابی نعروں پہ جمع ہونے والے ووٹروں کو اُس طرح کا رکن نہ سمجھا جائے جن پہ ہمارے لوگ بالمشافہ

طریقوں سے لمبی محنت کرتے ہیں۔ ووٹروں کو جمع کرنے کے تصور کے دباؤ سے رکنیت وغیرہ کے معیارات کو گھٹایا نہ جائے اور معیار پر مقدار (تعداد) کو ہرگز ترجیح نہ دی جائے، ورنہ جماعت کی بنیادیں جن تصورات پر رکھی گئی ہیں اور دستور کے جو تقاضے سامنے ہیں، ان سب کو نقصان پہنچے گا۔ یہاں تک کہ جماعت کے تعبدی و اخلاقی تشخص، اس کے تحریکی چہرے اور اس کے برسوں میں بننے والے مزاج کا تحفظ ممکن نہیں رہے گا۔

سیاست میں اگر صرف "جمہوریت" کا عنوان لے کے چلا جائے تو اس سے لازماً مراد مغرب کی لادین اور عوام پرست حکومت ہوتی ہے جس کے لیے ہونے والے انتخابات میں دینی مقاصد اور اخلاقی اقدار کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاسکتا۔ ایسی جمہوریت جب بھی نمودار ہوگی تو ایسے ایسے قوانین اور پالیسیاں اور اقدامات اور کارروائیاں سامنے آئیں گی کہ محبانِ دین کے سر چکرا جائیں گے۔ اور ایسا تجربہ آج ہو رہا ہے۔

مولانا مودودیؒ نے لادین مغربی جمہوریت پر بھرپور ضربیں لگا کر اسلامی جمہوریت (خلافت و شورائیت) کا کام کرنے کے لیے جو خطوطِ کار مرحلہ بہ مرحلہ تجویز کیے، ان سے حسب ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

۱۔ ہمیں ساری گفتگو اسلامی جمہوریت کے لیے کرنی چاہیے۔

۲۔ کوشش کرنی چاہیے کہ مروجہ جمہوریت میں ایسی تبدیلیاں ہو جائیں کہ گاڑی اسلامی جمہوریت کی راہ پر چلنے لگے۔ اس سلسلے میں ہر موقف اور موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے، ساری تدبیریں اختیار کرنی چاہییں۔ اور متحدہ و مشترکہ مطالبے سامنے لانے چاہییں۔

۳۔ ضروری ہے کہ انتخابی دور میں ووٹروں کے سامنے یہ اصول ضرور رکھے جائیں کہ انقلابِ قیادت سے کیا مراد ہے اور سامنے آنے والے امیدواروں میں کم سے کم کیا خوبیاں ہونی چاہییں۔ اس دعوت کو بار بار معاشرے کے مختلف حصوں میں پھیلایا جاتا رہے۔ اگر عین انتخابی بخار کے زمانے میں یہ کام نہ ہو سکے تو اس سے ایک ماہ قبل یا اور بھی پہلے کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ فی نفسہٖ دستور اور نظامِ انتخاب میں تبدیلیاں واقع ہونی چاہییں۔ اس کے لیے

قرار دادِ مقاصد پاس کرائی گئی اور بعد میں بھی امیدواروں کے اوصاف دستوری دفعات میں شامل کیے گئے۔ اگرچہ عملاً ان کو نظر انداز کیا گیا ہے۔

۵۔ اگر دینی قوتوں میں قابلِ اعتماد اتحاد پیدا نہ ہو سکے تو اضطراراً کسی دوسری قوت سے اتحاد کرنا پڑ سکتا ہے۔ اس صورت میں اوّل تو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ بدنام قوت نہ ہو، ناقابلِ اعتبار نہ ہو اور مخالفِ دین نہ ہو۔ دوسری بات یہ ضروری ہے کہ شرائطِ اتحاد میں دو ایک واضح نکات ایسے شامل ہونے چاہئیں جو نفاذِ اسلام سے متعلق عملی تقاضے سامنے لائیں۔ تیسرے یہ لازم ہے کہ مشترک نمائندے کھڑے کرنے کی صورت میں یہ شرط پہلے سے طے کی جائے کہ بہت ہی بدنام قسم کے کج اخلاق لوگوں کو دوسرے شرکائے اتحاد ٹکٹ نہ دیں گے، اور اگر دیں تو ایسے خاص حلقوں میں ہمارے ووٹروں سے ووٹ کا مطالبہ نہ کریں۔

۶۔ تبدیلیٔ جمہوریت اور اصلاحِ انتخابات کے لیے ایک بڑا مؤثر ذریعہ تناسب نمائندگی کا طریقہ ہے۔ مگر اس طریقے کو منوانے کے لیے کبھی کبھار کسی بیان یا تقریر کا ہو جانا کافی نہیں۔ اس کام کو اگر حتمی طور پر کرنا ہے تو ایک تحقیقی کتاب انگریزی میں اور ایک اُردو میں خوب پھیلائی جائے، پھر سیمینار منعقد کرائے جائیں، اخبارات کے فورم میں مباحثے ہوں، بعض اہم جرائد خاص نمبر نکالیں یا بڑے اخبار خصوصی ضمیمے شائع کریں۔ ہو سکے تو دو ایک بار تناسب نمائندگی کا ہفتہ منانے کی صورت اختیار کی جائے۔

اِس کام کے لیے کسی خاص کونسل یا کمیٹی کو پورا نقشہ تیار کرنا چاہیے۔ یہ کوئی سرسری کام نہیں ہے۔

لیکن اس کے باوجود منتخب ہونے والے ارکان کے لیے بھی اور وزراء کے لیے بھی دینی و اخلاقی معیارات ہونے چاہئیں۔

ہمارے منتخب دوستوں کا کام یہی نہیں کہ وہ اجلاسوں میں بیٹھیں اور روایتی پارٹ ادا کرتے رہیں۔ بلکہ انہیں ایک انقلابی جماعت کا نمائندہ ہونے کی وجہ سے ہر مسئلے میں اپنے خاص اندازِ گفتگو سے اسلامی انقلاب کے لیے کوئی لطیف اور خوبصورت بات ہمیشہ اُٹھاتے رہنا چاہیے۔ نیز ان کو تمام ممبران، وزراء، اسپیکر، اپوزیشن کے ساتھیوں اور افسرانِ حکومت (باقی بر صفحہ ۴۹)

عورت کی حکمرانی قرآن وسُنّت کی روشنی میں

جناب مولانا گوہر رحمٰن صاحب - مردان -

محترمہ بے نظیر بھٹو کا پاکستان کی وزیراعظم بن جانا ایک امرِ واقعہ ہے اور مغربی جمہوریت کے اصول کے مطابق بھی ہے۔ لیکن کچھ صحافی قسم کے لوگ اس امرِ واقعہ کو امرِ جائز قرار دینے کی کوشش کر رہے ہیں - اور اس کے لیے شرعی جواز تلاش کر رہے ہیں۔ حالانکہ عورت کی حکمرانی اسلام کے سیاسی اصول اور شریعت کے واضح احکام کے خلاف ہے۔ شریعت کے اصل احکام کا تحفظ ایک دینی فریضہ ہے - میری اس تحریر کا اصل محرک یہی دینی فریضہ ہے - اِس تحریر میں مسئلہ کی شرعی حیثیت مثبت انداز میں شرعی دلائل کے ساتھ واضح کی گئی ہے اور ان شبہات اور غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا گیا ہے جن کی بنا پر کچھ لوگ عورت کی حکمرانی کے لیے سندِ جواز فراہم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں - میں اس مضمون کے قارئین سے درخواست کرتا ہوں کہ سیاسی اغراض، گروہی مفادات اور پارٹی لائن سے بالا تر ہو کر خالص حق پسندی کے جذبے کے تحت اس مضمون کو پڑھیں اور تلاشِ حق کی نیت کے ساتھ اس پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں -

عورت کی حکمرانی شرعاً جائز نہیں ہے

پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے جس کی سیاست اسلامی نظریے کے تابع ہونی چاہیے اور اسلامی نظریے کی بنیاد قرآن وسنّت ہے اور قرآن وسنّت کی رُو سے عورت کی حکمرانی جائز نہیں ہے -

قرآنی آیات	اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۔ (النساء - ۳۴)

"مرد حاکم ہیں عورتوں پر کیونکہ زیادہ صلاحیتیں دی ہیں اللہ نے بعض کو بعض پر، اور خرچ کرتے ہیں وہ اپنا مال"

قوام منتظم اور نگران کو کہا جاتا ہے ۔ امیر اور حاکم بھی چونکہ انتظامیہ کا سربراہ ہوتا ہے، اس لیے قوام امیر اور حاکم کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ ابن جریر (م ۳۱۰ھ) نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ "اُمَرَآءُ عَلَیْھَا" "مرد عورتوں پر حکمران ہیں"[1]

امام فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ) اور امام ابن کثیرؒ (م ۷۷۴ھ) نے بھی قوامون کے یہی معنے لکھے ہیں کہ "اللہ نے مرد کو عورت کا امیر، رئیس اور حاکم بنایا ہے"۔[2]

اِس آیت کا تعلق اگرچہ سیاسۃ البیت سے ہے لیکن جب چھوٹی سی ریاست کی سربراہی عورت کو نہیں دی گئی تو سیاست المدن یعنی پورے ملک کی ایک ہمہ گیر حکومت کی سربراہی اُسے کیسے سپرد کی جا سکتی ہے ۔ مرد کے قوام ہونے کی وجہ اس آیت میں یہ بیان ہوتی ہے کہ اس کی ذہنی، نفسیاتی اور جسمانی صلاحیتیں عورت سے زیادہ ہیں ۔ یہ عورت کی تحقیر نہیں ہے، بلکہ یہ تفاوت تقسیم کار کے لیے قائم ہوا ہے ۔ فرائض کے اِسی تنوّع کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"اور تمنا نہ کرو اس چیز کی جس میں فضیلت دی ہے اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر مردوں کے لیے حصہ ہے ان کے اعمال کا اور عورتوں کے لیے حصہ ہے ان کے اعمال کا اور مانگا کرو اللہ سے اس کا فضل، بے شک اللہ ہر چیز کو جانتا ہے"۔ (النساء آیت ۳۲)

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری طبع مصر ۱۹۵۴ء جلد ۵ ص ۵۷ ۔

[2] تفسیر کبیر از امام رازی جلد ۱۰ ص ۸۸ و تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۷۴ ۔

اس آیت کی تشریح میں مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

"اللہ نے دنیا میں ہر گروہ کو دوسرے گروہ پر خاص خاص باتوں میں مزیت دی ہے اور ایسی ہی مزیت مردوں کو بھی عورتوں پر ہے۔ مرد عورتوں کی ضروریات معیشت کے قیام کا ذریعہ ہیں۔ اس لیے سربراہی و کارفرمائی کا مقام قدرتی طور پر انہی کے لیے ہو گیا ہے۔"[1]

۲۔ مرد کی قوامیت اور صلاحیتوں میں فوقیت کا ذکر سورۂ بقرہ میں اس طرح ہوا ہے۔

"اور عورتوں کا بھی حق ہے جس طرح کہ مردوں کا ان پر حق ہے شرعی قاعدے کے مطابق اور مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے اور اللہ غالب ہے اور حکمت والا ہے۔" (البقرہ - آیت ۲۲۸)

جاہلیتِ قدیمہ کے دور میں عورت کا کوئی بھی حق تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ اور اسے صرف استعمال کی ایک چیز سمجھا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تردید کی اور فرمایا کہ مرد اور عورت دونوں کے حقوق بھی ہیں اور فرائض بھی ہیں۔ اس کے مقابلے میں دورِ جدید کی جاہلیتِ جدیدہ کا دعویٰ یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں ہر اعتبار سے مساوی ہیں۔ اس غیر فطری دعوے کی بھی اللہ تعالیٰ نے تردید کی اور فرمایا کہ وَ لِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ کہ مرد کو عورت پر فوقیت حاصل ہے۔ یہ فوقیت اور فضیلت صرف عدت کے دوران حقِ رجوع ہی میں نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا ہے، بلکہ ذمہ داریوں کے اعتبار سے بھی ہے کہ مرد پر امارت اور سربراہی کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے اور عورت پر یہ بوجھ نہیں ڈالا گیا۔

۳۔ طالوت کی اہلیت کی وجوہات بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

زَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ (البقرہ - آیت ۲۴۷)

"زیادہ فراخی دی ہے اس کو اللہ نے علم میں اور جسم میں۔"

اس آیت میں علمی، عقلی اور جسمانی صلاحیتوں میں فوقیت و فضیلت کو اہلیت کی صفات میں شمار کیا

---

[1] تفسیر ترجمان القرآن از ابوالکلام آزاد، سورۃ النساء آیت ۳۲-۳۳۔

گیا ہے۔ صنفِ نازک کی جسمانی کمزوری تو ہر ایک کو معلوم ہے اور عقلی طور پر مردوں سے کم ہونا ارشادِ رسولؐ سے ثابت ہے[1]۔

علامہ فرید وجدیؒ نے اپنی کتاب "مسلمان عورت" اور دائرۃ المعارف القرآن العشرین میں علومِ جدیدہ کے یورپین ماہرین کی ایک بڑی تعداد کے مستند اقوال نقل کیے ہیں کہ عورت کی عقلی، نفسیاتی اور جسمانی صلاحیتوں کا مرد سے کم ہونا سائنٹیفک استدلال سے بھی ثابت ہو چکا ہے۔ جن ملکوں میں عورت نے مرد کے ساتھ ہر معاملے میں برابری کی کوشش کی ہے وہاں پر اس نے اپنی نسوانیت کا خون کر کے اپنی اصل صنفی حیثیت کو تباہ کر دیا ہے۔

۴۔ ازواجِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ:

وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ۔ (الاحزاب - ۳۳)

"اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ ٹھہری رہو"۔

امام جصاصؒ، قرطبیؒ اور ابن کثیرؒ نے اس آیت کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ تمام مسلمان خواتین کو حکم دیا گیا ہے کہ گھروں میں ٹھہری رہو اور ضرورت کے بغیر گھروں سے باہر نہ نکلو۔ اگر باہر نکلنے کی ضرورت ہو تو پھر پردے کی پابندی کرو۔ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ بیرونِ خانہ ذمہ داریاں اللہ تعالیٰ نے عورت پر نہیں ڈالیں۔ وزیر اعظم کے فرائضِ منصبی ظاہر ہے کہ "قرار فی البیت" کے حکمِ خداوندی کو توڑنے کے بغیر ادا نہیں کیے جا سکتے تو آخر وہ کونسی اضطراری صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے جس کی وجہ سے خدا کے اس حکم کو توڑا جائے۔ کیا مرد ختم ہو گئے ہیں یا سب کے سب نالائق ہیں؟

احادیثِ نبویہ

۱۔ کسریٰ کی بیٹی پوران دخت کو جب ایرانیوں نے اپنی ملکہ بنایا تو اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا:

لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا اَمْرَهُمُ امْرَأَةً۔ "جس قوم نے بھی عورت کو حکمران

[1] صحیح بخاری کتاب الحیض جلد ۱ ص ۴۴ و کتاب الشہادات جلد ۱ ص ۳۶۳۔

بنا یا وہ کامیاب نہیں ہوگی[1]

یہ ارشاد رسول اگرچہ اہلِ ایران کے بارے میں ہے لیکن مذمت کی اصل وجہ ایرانی ہونا نہیں ہے بلکہ عورت کو حکمران بنانا اصل وجہ ہے۔ پیپلز پارٹی والوں نے آج کسریٰ کی سنّت اور موروثی بادشاہتوں کی رسم کو اپنا کر پاکستان کی حکومت کو بھٹو خاندان کی میراث بنا دیا ہے۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کی حکمرانی کو ذلت قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ:

"جب تمہارے حکمران تم میں سے بد ترین لوگ ہوں اور تمہارے دولت مند لوگ بخیل ہوں اور تمہارے معاملات عورتوں کے حوالے کر دیئے جائیں تو پھر تمہارے لیے زمین کا پیٹ اس کی پیٹھ سے بہتر ہوگا۔"[2]

حدیث کا مقصد یہ ہے کہ ذلت کی اِس زندگی کو خوش دلی کے ساتھ برداشت نہ کرو، بلکہ اس صورتِ حال کو بدلنے کی کوشش کرو اور اس فتنے سے خود بھی بچو اور اپنی قوم کو بھی بچانے کی فکر کرو۔

۳۔ قال رسول اللہ ھلکت الرجال حین اطاعت النساء۔[3]

"مرد جب عورتوں کی فرمانبرداری قبول کر لیں تو تباہ و برباد ہو جائیں گے۔"

۴۔ قال رسول اللہ لن یُفلح قوم تملک رایھم امرأۃ۔[4]

"وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی جن کی سوچ پر ایک عورت حکمرانی کر رہی ہو۔"

---

[1] صحیح بخاری کتاب المغازی باب کتاب النبی الی کسریٰ وقیصر وصحیح بخاری کتاب الفتن۔

[2] سنن ترمذی ابواب الفتن باب نمبر ۶۴۔

[3] مستدرک حاکم جلد ۴ ص ۲۹۱ وقال الذہبی صحیح۔

[4] مجمع الزوائد باب ملک النساء جلد ۵ ص ۲۰۹۔

۵۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ لَا یُقَدِّسُ اللّٰہُ اُمَّۃً قَادَتْھُمْ اِمْرَأَۃٌ[1]

"اللہ تعالیٰ اُس قوم کو پاکیزہ قوم نہیں بناتا جس کی قیادت عورت کے ہاتھ میں ہو"

۶۔ تمام وہ احادیث بھی عورت کی حکمرانی کے جائز نہ ہونے کے دلائل ہیں، جن میں عورتوں کو ضرورت کے بغیر باہر گھومنے پھرنے سے منع کیا گیا ہے اور جن میں مردوں اور عورتوں کے مخلوط اور آزادانہ میل ملاپ سے منع کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ احکام کو توڑے بغیر کوئی عورت سربراہِ حکومت کی ذمہ داریاں پوری نہیں کر سکتی۔

قرآن وسنّت کے ان حوالوں سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو گئی ہے کہ عورت نہ سربراہِ ریاست بن سکتی ہے اور نہ سربراہ حکومت بن سکتی ہے۔ شریعت کا یہ حکم اگرچہ مغرب کی جمہوریت کے اُصول کے مطابق نہیں ہے لیکن اُمتِ مُسلمہ کے لیے معیارِ حق قرآن وسنّت ہے جمہورت نہیں ہے۔ شریعت اور جمہوریت کے درمیان جب تضاد آجائے تو اُمتِ مُسلمہ شریعت کو جمہوریت پر ترجیح دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے منصبِ رسالت پر کسی عورت کو مقرر نہیں کیا

قیادت وامارت اصل میں نبی کا فرضِ منصبی ہے اور اسی کے شایانِ شان بھی ہے۔ اسلامی حکومت کا سربراہ اللہ کے نبی کا نائب ہوتا ہے اور قرآن کریم میں صاف طور پر آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسالت کے منصب پر کبھی بھی کسی عورت کو مقرر نہیں کیا۔

"اور نہیں بھیجا تھا ہم نے (رسول بنا کر) آپؐ سے پہلے مگر مردوں کو وحی بھیجی تھی ہم نے ان کی طرف پس پوچھ لو اہلِ علم سے اگر تم نہیں جانتے"

(الانبیاء آیت نمبر ۷)

[1] مجمع الزوائد باب ملک النساء ج ۵ ص ۲۱۰

جب نبوت ورسالت مردوں کے لیے مخصوص ہے تو اسلامی حکومت کی سربراہی بھی مردوں کے لیے مخصوص ہے اس لیے کہ اسلامی حکومت کی سربراہی نبی کی نیابت ہوتی ہے۔

نماز کی امامت بھی مردوں کے لیے مخصوص ہے

فقہائے اسلام نے لکھا ہے کہ امامت کبریٰ (حکومت کی سربراہی) کا مستحق وہی ہو سکتا ہے جو امامتِ صغریٰ (نماز کی امامت) کی اہلیت رکھتا ہو۔ رسول اللہؐ اور خلفائے راشدین حکومت کے سربراہ بھی تھے اور نماز کی امامت بھی خود کرتے تھے۔ سقیفۂ بنو ساعدہ کے انتخابی اجلاس میں حضرت ابو بکرؓ کے استحقاق کی ایک دلیل یہ بھی بیان ہوئی تھی کہ جب رسول اللہؐ نے نماز کی امامت کے لیے انہیں مقرر فرمایا تھا تو امت کے دوسرے معاملات کی قیادت کے مستحق بھی یہی ہو سکتے ہیں۔ عورت جب نماز کی امامت نہیں کرا سکتی بلکہ اس کی اقتدا میں نماز ہوتی ہی نہیں — تو یہ حکومت یا ریاست کی سربراہ بھی نہیں بن سکتی۔

علماءِ علم الکلام اور فقہائے اسلام کی تصریحات

علم الکلام اور علم الفقہ دونوں میں وضاحت کے ساتھ شریعت کا یہ اصول اور حکم بیان ہوا ہے کہ حکومت کی سربراہی کے لیے مرد ہونا شرط ہے۔ علم الکلام کی کتابوں میں اہلِ سنت کے بنیادی اصول بیان ہوئے ہیں اور علمِ فقہ کی کتابوں میں اِن اصولوں کی روشنی میں عملی زندگی کے احکام و قوانین بیان ہوتے ہیں۔ عورت کی سربراہی کے جائز نہ ہونے کا یہ مسئلہ دونوں میں بیان ہوا ہے۔ بطورِ مثال چند حوالے ملاحظہ کیجیے:

۱-۲-۳- ابن الہمامؒ نے "المسایرہ" میں اور علامہ تفتازانی نے "شرح عقاید" اور "شرح مقاصد" میں لکھا ہے کہ:

"حکمران کی اہلیت کے لیے مرد ہونا شرط ہے"۔ [۱]

---

[۱] المسایرہ رکن رابع اصل تاسع۔ شرح عقائد و شرح مقاصد بحث امامت۔

۴۔ شرح عقائد کی شرح "نبراس" میں لکھا ہے کہ:

"امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ عورت نماز کی امامت کی طرح حکومت کی سربراہی بھی نہیں کر سکتی"[1]

۵۔ قاضی ابوبکر ابن العربیؒ متوفی ۵۴۳ھ لکھتے ہیں:

اِن امرأة لا تکون خلیفة ولا خلاف فیه

"عورت حکمران نہیں بن سکتی اور اس میں کوئی خلاف نہیں ہے۔"[2]

۶۔ امام قرطبیؒ متوفی ۶۷۱ھ لکھتے ہیں:

قد اجمعوا علی ان المرأة لا یجوز ان تکون اماما

"فقہاء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ عورت کا حکمران بنانا جائز نہیں ہے۔"[3]

۷۔ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

الملك الاعظم مختص بالرجال

"حکومت کی سربراہی مردوں کے لیے مخصوص ہے۔"[4]

۸۔ امام ابن حزم ظاہری متوفی ۴۵۶ھ لکھتے ہیں:

لا تحل الخلافة الا لرجل

"حکومت کی سربراہی حلال نہیں ہے مگر مردوں کے لیے"[5]

۹۔ ابن نجیم مصریؒ حنفی متوفی ۹۷۰ھ لکھتے ہیں:

"آمدی نے لکھا ہے کہ امامت (حکمرانی) کی متفقہ شرائط اہلیت

---

۱ نبراس ص ۵۳۶

۲ تفسیر قرطبی جلد ۱۳ ص ۱۸۳

۳ قرطبی جلد ۱ ص ۲۷۰ و جلد ۵ ص ۱۶۸

۴ تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۷۴

۵ المحلّٰی جلد ۹ ص ۳۵۹ کتاب الامامت

آٹھ ہیں:

۱۔ احکام شرعیہ کا علم ۲۔ جنگی امور کی مہارت ۳۔ مضبوط قوتِ ارادی (دلیری) ۴۔ پرہیزگار ہونا ۵۔ بالغ ہونا ۶۔ مرد ہونا ۷۔ آزاد ہونا۔ ۸۔ نفاذِ احکام کی قوت [1]

۱۰۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ متوفی ۱۱۷۶ھ لکھتے ہیں:

از آں جملہ آنست کہ مذکر باشد

"سربراہ حکومت کی شرائطِ اہلیت میں سے ایک یہ ہے کہ وہ مرد ہو" [2]

درمختار، شامی، تفسیر مظہری، نیل الاوطار اور تحفۃ الاحوذی میں بھی صراحۃً لکھا ہوا ہے کہ حکومت کی سربراہی مردوں کے لیے مخصوص ہے اور عورت سربراہ حکومت نہیں بن سکتی [3]

مولانا اشرف علی تھانویؒ متوفی ۱۳۶۲ھ لکھتے ہیں:۔

"ہماری شریعت میں عورت کو حکمران بنانے کی ممانعت ہے۔ پس بلقیس کے قصہ سے کوئی شبہ نہ کرے۔ اول تو یہ فعل مشرکین کا تھا، دوسرے اگر شریعتِ سلیمانیہ نے اس کی تقریر بھی کی ہو تو شرع محمدیؐ اس کے خلاف ہوتے ہوتے حجت نہیں" [4] و [5]

مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ سید امیر علی ملیح آبادیؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اور مفتی محمد شفیعؒ نے بھی اپنی تفاسیر میں لکھا ہے کہ حکومت کی سربراہی عورت کو

---

[1] الاشباہ والنظائر مع شرح الحموی طبع کراچی جلد ۲ ص ۲۲۶

[2] ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء طبع لاہور ۱۹۷۶ء ص ۴

[3] مجموعہ شامی جلد ۱ ص ۵۱۲۔ تفسیر مظہری سورۃ النساء آیت ۳۴۔ نیل الاوطار جلد ۹ ص ۱۶۸۔ تحفۃ الاحوذی جلد ۶ ص ۵۴۲ [4] بیان القرآن النمل آیت ۲۳۔

[5] یہاں مراد یہ ہے کہ "تو شرعِ محمدیؐ میں اس کی مخالفت کے ہوتے ہوئے وہ حجت نہیں"

دینا جائز نہیں ہے۔[1]

مفکرِ اسلام مولانا مودودیؒ متوفی ۱۳۹۹ھ لکھتے ہیں :

"مملکت میں ذمہ داری کے مناصب خواہ وہ صدارت ہو یا وزارت یا مجلسِ شوریٰ کی رکنیت یا مختلف محکموں کی ادارت، عورت کے سپرد نہیں کیے جا سکتے"۔[2]

(باقی)

---

[1] ترجمان القرآن۔ النساء ۳۴۔ مواہب الرحمٰن جلد ۵ ص ۳۱۔ تفسیر ماجدی۔ سورۃ النمل آیت ۲۳۔ معارف القرآن جلد ۶ ص ۵۶۱ النمل آیت ۲۳۔

[2] اسلامی ریاست ص ۱۷۹۔

علم کی اسلامی تشکیل

نتیجۂ فکر اسماعیل الراجی الفاروقی شہید

(۲)

المیہ کا قائم بالذات سبب اِس امر میں کوئی شک نہیں کہ اُمت کے المیہ کا خاص سبب اور اس کی جڑ مروجہ نظامِ تعلیم ہے۔ یہی وہ زمین ہے جس میں مرض کو پھلنے پھولنے کے وافر مواقع میسر آتے ہیں۔ اسکولوں تعلیم گاہوں اور کالجوں ہی میں ہی اسلام سے دوری، اسلامی اقدار و روایات سے بے نیازی اور اس کے ضوابط و اصول سے روگردانی کے جراثیم پرورش پاتے ہیں۔ موجودہ تعلیمی نظام ایک ایسی تجربہ گاہ ہے جہاں نوجوان طلباء کے ذہن کو نئے نقشوں سے آراستہ کیا جاتا اور نئے سانچوں میں ڈھالا جاتا ہے اور جہاں ان کے شعور کو مغربیت کی بھٹی میں تپایا جاتا ہے اور یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جس میں مسلمانوں کا اپنے اسلامی ماضی سے رشتہ شعوری طور پر منقطع ہو جاتا ہے۔ اپنے اسلاف کے ورثہ کو حاصل کرنے کی فطری جستجو اس کے اندر دم توڑ دیتی ہے اور اسی مرحلہ پر اسلاف سے معنوی رشتہ قائم کرنے کی خواہش اور اسلام کا فکری اور عملی احیاء اور تنقید کی طلب ان شکوک و شبہات کی نذر ہو جاتی ہے جو نظامِ تعلیم نے ان کے شعور کے ہر رگ و ریشہ میں پیوست کر دیئے ہیں۔

مسلمان دنیا میں تعلیم کی موجودہ حالت اب تک کی عظیم تعلیمی ترویج و اشاعت کے باوجود مسلمانوں کے تعلیمی معیار کی حالت ہنوز دگرگوں ہے۔ جہاں تک اسلامی احیاء کا تعلق ہے، روایتی اور بے دین درسگاہیں، کالج اور جامعات مغربیت کی وکالت میں اب سے پہلے کبھی اس قدر جری اور بے باک نہ تھیں جتنی آج ہیں۔ اور اس سے پیشتر کبھی ان کو ہم خیال مسلم طلباء کی اتنی کثیر تعداد نصیب نہ ہوئی تھی جتنی

آج ہے۔ اپنی ابتدا کے استعماری زمانہ سے لے کر آج تک بے دین تعلیمی نظام نے بے اندازہ ترقی کر لی ہے اور اسلامی نظام کو درسگاہوں سے نکال باہر کیا ہے۔ موجودہ دور میں اسلامی تعلیمی نظام محض ایک انفرادی مسئلہ کی حیثیت سے باقی ہے جس کو ہر طرح کے عوامی وسائل سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اور اگر کسی اسلامی ادارہ کو عوامی خزانہ سے حصہ دیا بھی جاتا ہے، جو اس کا جائز حق ہے، تو ساتھ ہی جدیدیت اور ترقی کے نام پر بے دین (سیکولر) نصاب کو داخل کرنے کی شرط بھی عائد کر دی جاتی ہے۔ ایسا عموماً نصابِ تعلیم کو دو مختلف بلکہ متضاد حصوں میں بانٹ کر کیا جاتا ہے۔ ایک کو "اسلامی" سمجھا جاتا ہے اور دوسرے کو "جدید"۔ اس کی نمایاں اور مستند ترین مثال جامعۃ الازہر ہے۔ نصابِ تعلیم کا "اسلامی جزو" قابلِ تغیر سمجھا جاتا ہے، کچھ قدامت پرستی اور مفاد پرستی کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ لادین تعلیمی نظام یہ چاہتا ہے کہ دینی نصاب کا دنیائے حقیقت سے رشتہ منقطع رکھا جائے اور جدید افکار کے قریب اس کو پھٹکنے نہ دیا جائے تاکہ یہ نصاب فرسودہ سے فرسودہ تر ہوتا چلا جائے اور اس کو پڑھنے والے طلباء کا صلاحیت، لیاقت اور امتیاز میں ان طلباء سے کوئی موازنہ ہی نہ ہو جو لادینی درسگاہوں سے پڑھ کر نکلتے ہیں۔ یہ سب استعمار پسند قوتوں کی ریشہ دوانیاں اور سازشیں ہیں۔ قومی آزادی کے بعد اسی لادینی نظام کو بہتر اور اپنا سمجھ کر قبول کر لیا گیا جو اس کے لیئے زبردست تقویت کا باعث بنا۔ سیاسی سطح پر آزاد ہونے والی قوموں نے اس نظام کی پختگی، ترویج اور اشاعت کی خاطر عوامی خزانہ کا منہ کھول دیا اور قومیت کے نام پر اس نظام کو بے دین سے بد دین بنا دیا۔ مغربیت پرست اور خدا بیزار قوتیں اب بھی سرگرم عمل ہیں اور اساتذہ و طلباء کو اسلام سے دور لے جانے والی مہمات درسگاہوں اور کالجوں میں اب بھی پرشور طریقہ پر جاری ہیں اور اس عظیم فتنہ کے سدباب کے لیئے ہنوز کچھ نہیں کیا جا رہا ہے۔ درحقیقت آج کل تعلیمی حالت استعماری دور سے بھی ابتر ہے۔ اس وقت ہر ایک کو آزادی کی تڑپ، مسئلہ کے اسلامی حل کی تلاش اور مدافعت کی جستجو مضطرب رکھتی ہے۔ مگر آج جمود، کاہلی، قائدین پر بے اعتنائی جیسی صفات کا دور دورہ ہے جس کا افسوسناک سبب اخلاق و پاسِ وفا سے عاری قائدین کی مجرمانہ غفلت، جھوٹے وعدے اور مایوس کن اقدامات ہیں۔ کوئی بھی اسلامی حکومت، یونیورسٹی انتظامیہ یا عوامی تنظیم کالجوں کے نوجوان طلباء کے بگڑے ہوئے اخلاق کی اصلاح کے متعلق کچھ نہیں کر رہی ہے نہ ہی تعلیم کے ذریعہ ان میں خطرناک حد تک راہ پا جانے

والے غیر اسلامی رجحان کو روکنے اور اس پر بند لگانے کے لیے کوئی راہِ عمل پیش کی جاسکتی ہے۔ باثروت ممالک میں عظیم پیمانے پر عمارتی توسیع اور طلباء کی تعداد اور علمی شعبوں اور کالجوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ جیسی خصوصیات نتائج کے اعتبار سے لادین نظام تعلیم کے حق میں ہی سودمند ثابت ہوتی ہیں۔ اور اسی کے مقصد کو پورا کرتی ہیں۔ کوئی بھی رقم اس لیئے منظور نہیں کی جاتی کہ تعلیمی اداروں کی تجدید کا پرخلوص جذبہ نیتوں میں کارفرما ہے۔ بالفاظ دیگر تعلیم کو اسلامی نہج پر لانے یا کالجوں اور طلباء کو اسلامی طرز فکر سے متاثر کرنے کا جذبہ درسگاہوں کی ظاہری بہتری کے پس پشت نہیں پایا جاتا ہر ادارہ وہی لکیر کا فقیر نظر آتا ہے۔ ہر جگہ اسی مغربی تعلیمی نمونے پر ڈھل جانے کے لیئے برق رفتاری سے مسابقت جاری ہے۔

ضعف بصیرت

سارے مخالف دلائل کے باوجود حقیقت امری یہی ہے کہ جدید تعلیم کے نتیجہ میں مغربی سانچہ میں پورا نہیں اترا جاسکا ہے بلکہ جو کچھ تیار ہوا ہے وہ مغربیت کا ایک بھونڈا اور مضحکہ خیز نمونہ ہے۔ اسلامی نمونہ کے مثل، مغربی نمونہ کا انحصار بھی ایک تخیل پہ ہے اور اس تخیل کو لباس مجاز میں دیکھ لینے کی خواہش ہی اس کی تنقید کا محرک ہے۔ عمارتیں، دفتر، لائبریریاں، تجربہ گاہیں، کلاس رومز، تقریب گاہیں اور طلباء اور شعبوں کی لمبی تعداد وغیرہ تو محض سطحی اہمیت کی حامل چیزیں ہیں جو کسی اعلیٰ مقصد یا بصیرت کے بغیر کسی شمار میں نہیں۔ کسی بھی تخیلی مقصد کی نقل نہیں کی جاسکتی، صرف اس کے سطحی اور غیر اہم مظاہر کی کی جاسکتی ہے۔ گویا ضمنیات اور فروعیات میں تو الجھا جاسکتا ہے مگر اصل شے جو حقیقتِ مظاہر ہے پھر بھی ہاتھ نہیں لگتی۔ یقیناً یہی سبب ہے کہ تقریباً دو صدیاں گزر جانے کے بعد بھی مغربی طرز کی لادینی طرزِ تعلیم سے مسلمان کچھ بھی حاصل نہ کرسکے۔ نہ کوئی مدرسہ، نہ کالج، نہ یونیورسٹی، نہ ہی دانشوروں کی کوئی ایسی جماعت کہ جو مغربی دانش کی خلاقیت اور کمال سے لوہا لے سکے۔ اسلامی دنیا کی تعلیم گاہوں کے پست تعلیمی معیار کا لاینحل مسئلہ اسی ضعف بصیرت کا لازمی نتیجہ ہے۔ جستجو کے بغیر علم کا حصول ممکن ہی نہیں اور جستجو ایسی شے ہے جس کی نقل نہیں کی جاسکتی یا جو مستعار نہیں لیجا سکتی۔ یہ تو خود شناسی اور خدا شناسی کی صفت سے ابھرتی ہے، مختصراً یہ ایمان کی دین ہے۔ مسلم دنیا کے نظام تعلیم میں مطلوبہ بصیرت مفقود رہی ہے۔ مسلم قیادت مغربی بصیرت سے تو عاری ہے ہی اور اسلامی بصیرت سے اس نے خود کو جہالت، کاہلی اور لاتعلقی کی وجہ سے محروم کر رکھا ہے۔ مسلم دنیا کی تعلیمی قیادت بھی افادیت پرست اور سطحی چلی آتی ہے، جس

کے پاس نہ کوئی تہذیب ہے اور نہ کوئی مقصد۔ گذشتہ دو صدیوں کے دوران مغربی تعلیم گاہوں کو فلسفۂ قومیت (یا قوم پرستی) نے مہمیز دی اس لیے کہ رومانیت نے عیسائیت کے بے دخل خدا کی جگہ قوم کو حقیقتِ عظمیٰ کی حیثیت سے لا بٹھایا۔ مگر مسلمان کے لیئے کوئی حقیقت اخروی یا عظمیٰ نہیں ہے سوائے خدا تعالیٰ کے۔ ایک قومی مملکت کے سامنے سرعبدیت خم کرنا مسلمان کے لیئے نہ صرف ناممکن ہے بلکہ شرک کے مترادف بھی۔ مسلمانوں کا اپنے دینی ورثہ سے اور ماضی سے جو تعلق بھی ہی، اس کے لیے ان معنوں میں "قوم پرست" ہو جانا ممکن ہی نہیں جن معنوں میں ایک یورپین ہو سکتا ہے جو اپنے مذہب، عیسائیت کی ساری حدود پامال کر کے کہیں کا کہیں پہنچ چکا ہو۔

کسی مسلم یونیورسٹی کے استاد کی اعلیٰ ترین مثال کو لیجیئے یعنی ایسا پروفیسر جس نے کسی مغربی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند لی ہو۔ اس کی تعلیم و تربیت مغرب میں ہوئی ہے اور اس نے اوسط ڈویژن میں یا اس سے کم میں کامیابی حاصل کی ہے۔ چونکہ اس کے مقصد تعلیم کا اول محرک اسلام نہیں تھا اس لیئے اس نے مغرب میں وہ سب کچھ نہیں سیکھا جو وہ سیکھ سکتا تھا۔ وہ اس مقصد کو لے کر وطن سے روانہ ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر تعلیم حاصل کرے گا، بلکہ اس کا مقصد مادی تھا یا ذاتی تھا یا زیادہ سے زیادہ قومی تھا۔ اسی لیے وہ اپنے مطلب کی چیز حاصل کر کے واپس آگیا۔ نہ تو اس نے اپنے مغربی اساتذہ کو اپنی صلاحیتوں اور علم میں اضافہ کر کے مات دینے کی کوشش کی، نہ ہی اس نے اپنے اسلاف کی پیروی میں — جنھوں نے قدیم یونان، ایران اور ہندوستان کے علوم پر اچھی طرح دسترس حاصل کرنے کے بعد ان کو اسلامی رنگ میں رنگ دیا تھا۔ اپنے سیکھے ہوئے علم کو اچھی طرح ذہن نشین کیا اور نہ اس کو اسلامی علم و صداقت کی روشنی میں صحیح رُخ دینے کی کوئی فکر کی۔ بلکہ اس کی آرزوؤں کی معراج بس یہ تھی کہ اس نے بھلے برے نمبرات سے امتحان پاس کر لیا، سند حاصل کر لی، اور وطن واپس آکر شہرت اور پیسے کے اعتبار سے اچھا مقام حاصل کر لینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے علم کی آخری رسائی صرف وہ درسی کتب ہیں جو اس کو عرصۂ طالبعلمی کے دوران پڑھنا پڑی تھیں، اس لیے کہ اب نہ اس کے پاس وقت ہے نہ قوت اور نہ تحریک کہ وہ اپنے علم کی حدود کو وسیع کرنے کی زحمت میں خواہ مخواہ مبتلا ہو۔ اس کا طرز زندگی اور پیشہ ورانہ حالات اس کو اس مطلوبہ معیار سے دور دھکیل دیتے ہیں۔ فطری نتیجہ کے طور پر اس کے شاگرد اس سے زیادہ کم ہمت اور زیادہ ناکارہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے لیے تو مغربی معیار بھی بعید تر از رسائی

ہوجاتا ہے۔ تدریجاً معیارات گرنے لگتے ہیں اور مسلم دنیا میں مغربی تعلیم کا تجربہ مغربی نمونہ کی محض بھدی نقالی سے آگے نہیں بڑھ پاتا۔

موجودہ مسلم دنیا میں پڑھا جانے والا مواد اور طریق تعلیم، مغربی مواد اور طریقوں کی نقل ہے، مگر وہ اس بصیرت اور تخیل سے خالی ہے جو مغربی دنیا میں موجود تھا۔ تخیل اور بصیرت کے فقدان کے سبب یہ چیزیں محض دوسرے درجہ کی پیداوار کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ شعوری طور پر عاری البصیرت علمی مواد اور طریق ہائے تعلیم طلباء کو اسلام سے بعید تر کرنے کا زہریلا اور ناپاک عمل جاری رکھتے ہیں۔ اور بظاہر اسلامی تعلیمی مواد اور طریق ہائے تعلیم کی غیر موجودگی میں ان کے بدل کے بہانے اور ترقی اور جدیدت کے خوشنما ناموں کے سہارے اپنے منحوس اثرات قائم کرتے رہتے ہیں۔ نتیجتاً یہ عوامل مسلم یونیورسٹی کے طالبعلم کو ایک مخصوص طرز کا (SOPHOMER) بنا کر چھوڑتے ہیں، جو برائے نام علم رکھنے کے باوجود اپنے بحر العلوم ہونے کے زعم باطل میں تاگردن غرق رہتا ہے۔

اس طرح مسلمان طلباء کا مغربی علوم پر دسترس حاصل کرلینے کا امکان ہی ختم ہوجاتا ہے۔ اس لیے کہ اس امکان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ علم کی وحدت پر گہری عالمانہ اور محققانہ نظر ہو اور جستجو کا ایسا جذبہ ہو جو نئے امکانات تلاش کرنے کا محرک بنے اور بصیرت اس سعی میں علم کی وحدت کو پیچھے چھوڑ جائے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اوّل الذکر کا انحصار آخر الذکر پر ہے، کیونکہ وحدت کا علم حاصل کرنے کے لیے ایک ایسے محرک خیال کا ہونا ضروری ہے جو آدمی کی توجہ کو اپنے اندر جذب کرلے۔ اس نوع کا محرک خیال کسی مقصد سے وابستگی ہی کر سکتی ہے۔ مقصد سے بے نیاز مسلمان سے یہ توقع فضول ہے کہ وہ کسی بھی مضمون پر کامل عبور حاصل کرلے گا۔ اور ظاہر ہے کہ مطلوبہ کاملیت کے بغیر زیر مطالعہ علم کی فنّی کیفیت کی حدود کو عبور کرکے نئی جہات کی جانب پیش قدمی کرنا ناممکن الخیال بات ہے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ کے بس میں یہ نہیں کہ وہ وجہ امتیاز کو بھی طلبہ کے ذہنوں تک منتقل کردیں۔ ہوتا یہ ہے کہ اساتذہ اپنے ادھ کچرے علم پر ہی اکتفا کرلیتے ہیں اور اسی کو طلبہ تک منتقل کر دیتے ہیں۔ اور اس طرح وہ خود بھی اور ان کے طلباء بھی محض دوسرے درجہ کی کارکردگی سے ہی مطمئن و مسرور رہتے ہیں۔

یہ حقیقت کہ مسلم یونیورسٹیوں کے اساتذہ اسلامی طرز فکر کے حامل نہیں اور ان کے اعمال کا محرک اسلامی نصب العین نہیں ہے، اسلامی تعلیمی نظام کا المیاتی پہلو ہے۔ تمام مسلم دنیا میں

وہی طلبہ یونیورسٹیوں میں داخلہ لیتے ہیں جو کم از کم اسلامی طرز فکر سے بعض اوقات بڑی حد تک اور اکثر بالکل نا آشنا ہوتے ہیں۔ اسکولوں یا مدرسوں میں ان کو برائے نام تعلیم دی جاتی ہے، جو ان کو کسی مقصد سے آشنا کرنے یا ان میں اسلامی بصیرت پیدا کرنے کے لیے قطعاً ناکافی ہوتی ہیں۔ نیا طالب علم نظریاتی طور پر سادہ لوح کی حیثیت سے داخل ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا دماغ جذبات سے پُر ہو مگر وہ نظریات سے خالی ہوتا ہے اور اس کا ذہن کا جذباتی تانا بانا بھی اس وقت ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے جب بوقت مطالعہ اس کا ٹکراؤ نظریات، حقائق اور سائنس کے معروضی نتائج سے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے طالب علم مدافعت کی پوزیشن میں نہیں ہوتا۔ اس کے پاس وہ نظریات، افکار اور بصیرت ہی نہیں ہوتی جس کے بل پر وہ نظریات کے میدان میں اترنے اور لوہا منوا لینے کی ہمت کر سکے۔ گو کہ وہ تعلیم کے اختتام تک مکمل ملحد، لادین یا اشتراکی نہ بھی ہو سکے، اسلام کے متعلق اس کا نظریہ سکڑ کر لوگوں اور خاندان کے ساتھ صرف شخصی اور جذباتی تعلق کی حد تک باقی رہ جاتا ہے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ اسلام ایک متحرک نظریہ ہے جو جملہ مسائل کو بطریقِ احسن حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مسلمان طالب علم کا مسلم یونیورسٹیوں میں درسی کتابوں میں موجود اور کلاسوں میں پڑھائے جانے والے اجنبی اور غیر علوم کا ذہنی دفاع کرنے کی مثال کچھ ایسی ہوگی کہ جیسے تلوار اور ڈھال لے کر کوئی سپاہی مشین گن اور ٹینک کا مقابلہ کرنے نکل کھڑا ہو۔ مسلم دنیا میں طلباء کو کہیں بھی اسلامی نظریۂ فکر کی تعلیم نہیں دی جاتی جب کہ مغرب کے تمام اسکولوں میں مغربی نظریۂ فکر کی تعلیم دی جاتی ہے۔ نوعمر طلباء کو مستقل مزاجی، آفاقیت، انتہائی سنجیدگی اور انہماک کی سخت تربیت دی جاتی ہے۔ اسلامی دنیا میں کہیں بھی یہ طرز فکر تمام طلباء کے لیئے بنیادی طور پر لازمی جزو تعلیم کی حیثیت نہیں رکھتا۔

تصحیح

ترجمان القرآن شمارہ مارچ کے ص ۲۲/۲۲ پر سطر ۱۲ میں جو آیت درج ہے۔ اس کے ابتدائی الفاظ درست کر لیں۔

لَا يُغَيِّرُ اللَّهَ (غلط) إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ (درست)

نبیٔ اکرمؐ کا خطبۂ رمضان المبارک

اور اس کے ادبی محاسن

جناب محمد محسن ٹونکی صاحب

عَنْ سَلْمَانَ الْفَارِسِيِّ قَالَ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ اٰخِرِ يَوْمٍ مِنْ شَعْبَانَ فَقَالَ :

ترجمہ: سلمان فارسی سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا کہ شعبان کی آخری تاریخ کو نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا جس میں فرمایا:

۱۔ يَا اَيُّهَا النَّاسُ ! قَدْ اَظَلَّكُمْ شَهْرٌ عَظِيْمٌ، شَهْرٌ مُبَارَكٌ

ترجمہ: اے لوگو۔ ایک بڑی عظمت والا، اور بڑی برکت والا مہینہ تم پر سایہ فگن ہو گیا ہے۔

۲۔ فِيْهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ

ترجمہ: وہ ایسا مہینہ ہے جس کی ایک رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔

۳۔ جَعَلَ اللّٰہُ صِيَامَهٗ فَرِيْضَةً وَقِيَامَ لَيْلِهٖ تَطَوُّعًا۔

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے اس مہینے کے روزوں کو فرض قرار دیا ہے، اور اس کی راتوں کے قیام کو نفل قرار دیا ہے۔ (یعنی تراویح فرض نہیں ہے، بلکہ سنت ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے)۔

۴۔ مَنْ تَقَرَّبَ فِيْهِ بِخَصْلَةٍ مِنَ الْخَيْرِ كَانَ كَمَنْ اَدّٰى

فَرِيْضَةً فِيْ مَا سِوَاهُ -

ترجمہ: جو شخص اِس مہینے میں کوئی نیک کام اپنے دل کی خوشی سے بطورِ خود کرے گا تو وہ ایسا ہوگا جیسے کہ رمضان کے سوا اور مہینوں میں فرض ادا کیا ہو۔

۵ــ وَمَنْ اَدّٰى فَرِيْضَةً فِيْهِ كَانَ كَمَنْ اَدّٰى سَبْعِيْنَ فَرِيْضَةً فِيْ مَا سِوَاهُ -

ترجمہ: اور جو اِس مہینے میں فرض ادا کرے گا تو ایسا ہوگا جیسے کہ رمضان کے سوا دوسرے مہینے میں کسی نے ستر فرض ادا کیے۔

۶ــ وَهُوَ شَهْرُ الصَّبْرِ وَالصَّبْرُ ثَوَابُهُ الْجَنَّةُ -

ترجمہ: اور یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنّت ہے۔

۷ــ وَشَهْرُ الْمُوَاسَاةِ -

ترجمہ: اور یہ مہینہ سوسائٹی کے غرباء اور فقراء کے ساتھ ہمدردی اور غمخواری کا مہینہ ہے۔

صبر کا مہینہ ہونے سے مُراد یہ ہے کہ روزوں کے ذریعے مومن کو خدا کی راہ میں جمنے اور خواہشات پر قابو پانے یعنی استقلال و استقامت کی تربیت دی جاتی ہے۔ اِس سے اطاعتِ الٰہی کا جذبہ فروغ پاتا ہے۔ اِس سے اس بات کی مشق ہوتی ہے کہ موقع پڑنے پر وہ اپنے جذبات و خواہشات اور بھوک پیاس پر کتنا قابو رکھ سکتا ہے۔ مومن کی مثال میدانِ جنگ کے سپاہی کی سی ہے جسے طوعاً و کرہاً شیطانی طاقتوں اور نفسانی خواہشوں سے لڑنا ہے۔ اگر اس کے اندر صبر کی صفت نہ ہو تو حملہ کی ابتدا ہی میں وہ ہتھیار ڈال دے گا۔

اور "ہمدردی کا مہینہ" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ روزہ دار جو اہلِ استطاعت ہیں، ان کو چاہیے کہ بستی کے حاجت مندوں کو خدا تعالیٰ کے دیئے ہوئے انعام میں شریک کریں اور ان کی سحری اور افطاری کا انتظام کریں۔

۸ــ وَشَهْرٌ يُزَادُ رِزْقُ الْمُؤْمِنِ فِيْهِ -

ترجمہ: اس مہینہ میں مومن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے۔

۹۔ وَهُوَ شَهْرٌ اَوَّلُهٗ رَحْمَةٌ وَّاَوْسَطُهٗ مَغْفِرَةٌ وَّاٰخِرُهٗ عِتْقٌ مِّنَ النَّارِ۔

ترجمہ: اِس مہینہ کا اوّل عشرہ اللہ کی رحمت، درمیانی عشرہ مغفرت اور آخری عشرہ آگ سے آزادی ہے۔

۱۰۔ وَشَهْرٌ مَنْ فَطَّرَ فِيْهِ صَائِمًا كَانَ مَغْفِرَةً لِّذُنُوْبِهٖ وَعِتْقَ رَقَبَتِهٖ مِنَ النَّارِ۔

ترجمہ: اِس ماہ مبارک میں کسی روزہ دار کی روزہ کشائی گناہوں کی بخشش اور آگ سے گردن خلاصی کا سبب بن جاتی ہے۔

۱۱۔ وَمَنْ اَسْقٰى صَائِمًا سَقَاهُ اللّٰهُ مِنْ حَوْضِىْ شَرْبَةً لَّا يَظْمَأُ حَتّٰى يَدْخُلَ الْجَنَّةَ۔

ترجمہ: اور کسی روزہ دار کی پیاس بجھانے کا اجر و ثواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن، میرے حوض سے ایسا پانی پلائیں گے کہ اس کے بعد جنت میں داخل ہونے تک پیاس نہیں لگے گی۔

۱۲۔ وَشَهْرٌ مَنْ خَفَّفَ عَنْ مَّمْلُوْكِهٖ فِيْهِ غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ وَاَعْتَقَهٗ مِنَ النَّارِ۔

ترجمہ: اور جو شخص اِس مہینہ میں اپنے غلام یا مزدور کے کام میں تخفیف کر دے تو حق تعالیٰ شانہٗ اُس کی بخشش فرماتے ہیں اور آگ سے آزاد کر دیتے ہیں۔

ادبی محاسن

۱۔ قَدْ اَظَلَّكُمْ شَهْرٌ عَظِيْمٌ۔ شَهْرٌ مُّبَارَكٌ۔

ماہِ مبارک کی اہمیت کو ظاہر کرنے والا نہایت مؤثر اور پُر زور جملہ ہے۔ زورِ بیان سے معمور ہے۔ قَدْ اَظَلَّ میں لفظِ (قَدْ) نے یقینِ تام پیدا کر دیا ہے۔ پورے یقین کے سامنے کہا جا رہا ہے کہ ماہِ مبارک سایہ انداز ہو چکا ہے۔ اِس کے ورودِ مسعود میں کوئی اشتباہ

باقی نہیں ہے۔

فعل اَظَلَّ پر غور کیجیے۔ اس کا ماخذ ظِلٌّ ہے بمعنی سایہ۔ اِس جملہ میں (شَهْرٌ) کو (شجر) سے استعارہ کیا گیا ہے اور اس کے لیے اَظَلَّ کا فعل بجائے خود قرینہ ہے۔ یعنی یہ ماہِ مبارک تمہارے لیے سایۂ شجر کی طرح سکون بخش اور حرارت رُبا ہے بشرطیکہ تم گرم جوشی سے اس کا استقبال کرو۔ اور اس کے تقاضوں کو پورا کرو۔

اس جملہ میں استعارہ بالکنایہ کا ادبی گوہر اپنی آب و تاب دکھا رہا ہے۔ شَهْرٌ مستعار لہ اور (شجر) مستعار منہ ہے۔ جملہ میں شجر کا لفظ موجود نہیں ہے، مگر اس کی صفت یعنی سایہ یا سایہ فگنی ضرور موجود ہے جو شجر کے لیے قرینہ ہے۔ استعارہ بالکنایہ کی تعریف یہی ہے کہ اس میں مستعار منہ مذکور نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی کوئی صفت مذکور ہوتی ہے جو اس کے لیے قرینہ بنتی ہے مستعار لہ اور مستعار منہ کے مابین وصفِ مشترک کو وجہِ جامع کہتے ہیں۔ دیکھیے وجہِ جامع میں کیسی کامل مطابقت ہے۔ وجہِ جامع کی زیادتی بھی استعارے کی بلاغت کا سبب ہوتی ہے۔ اِس میں ایک سے زائد وجہِ جامع ہیں۔ اور وہ یہ ہیں۔ آسودگی، حرارت رُبائی، تروتازگی، فلاح نجات وغیرہ۔

اِسی جملے کے مرکباتِ توصیفی کو دیکھیے اور دونوں مرکبات کا انداز دیکھیے۔

۱۔ شَهْرٌ عَظِيْمٌ۔ شَهْرٌ مُبَارَكٌ۔

۲۔ شَهْرٌ عَظِيْمٌ مُبَارَكٌ۔

پہلا اندازِ بیان شَهْرٌ کی تکرار کی وجہ سے نہایت پُرزور ہے، مگر دوسرا انداز بالکل سیدھا سادہ ہے۔

۳۔ فِيْهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِنْ اَلْفِ شَهْرٍ۔

یہ رمضان المبارک ہی کی امتیازی اور خصوصی صفت ہے۔ اس میں کوئی مہینہ اس کا رقیب نہیں۔

۴۔ جَعَلَ اللّٰهُ صِيَامَهٗ فَرِيْضَةً......

یہ بھی اسی ماہِ مبارک کا خاصہ ہے۔

۵۔ مَنْ تَقَرَّبَ فِيْهِ بِخَصْلَةٍ مِنَ الْخَيْرِ۔
یہ جملہ تشبیہ کے ادبی حسن سے مزین ہے۔ ادبی حسن کا بھی حامل ہے اور وصف خاص بھی بیان کرتا ہے۔ یعنی اس ماہِ مبارک کی یہ شان ہے کہ معمولی درجہ کی نیکیاں فرائض کے قائم مقام ہو جاتی ہیں۔ کہ یک شبِ چراغ بھی گوہرِ شب چراغ بن جاتا ہے۔ ذرے خورشید تمثال ہو جاتے ہیں۔ اور خزف ریزے لآلی۔ نیکی کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ اُس کا نرخ بالا ہو جاتا ہے۔

جملہ میں " خَصْلَةٌ مِّنَ الْخَيْرِ " کا مرکب مُشبّہ اور " فریضۃ " کا لفظِ مفرد "مُشبّہ بہ" ہے۔ قدر و قیمت کا بڑھ جانا اور نرخ کا بالا ہو جانا" وجہِ شبہ" ہے۔ کَمَنْ حرفِ تشبیہ ہے۔

۶۔ وَمَنْ اَدّٰى فَرِيْضَةً فِيْهِ۔
اِس جملہ میں بھی تشبیہی حسن و جمال ہے۔ " فَرِيْضَةً " مشبّہ اور " سَبْعِيْنَ فَرِيْضَةً " مُشبّہ بہ ہے۔ وجہِ شبہ اور حرفِ تشبیہ وہی ہیں جو اُوپر کے جملہ میں ہیں دیکھیے دونوں جملوں میں مشبّہ اور مُشبّہ بہ کے درمیان کیسا لفظی اور ترکیبی اختلاف ہے۔

۷۔ وَهُوَ شَهْرُ الصَّبْرِ۔
اِس جملہ کو مزید وضاحت کے طور پر یوں سمجھیے۔
۱۔ شَهْرُ رَمَضَانَ شَهْرُ الصَّبْرِ یا اسے مقلوب کر کے یوں کہیے۔
۲۔ شَهْرُ الصَّبْرِ شَهْرُ رَمَضَانَ۔

یعنی اِس جملہ میں تقلب یا تصرف ممکن ہے۔ ہم مشبّہ کو مشبّہ بہ اور مشبّہ بہ کو مشبّہ بنا سکتے ہیں۔ پھر اس جملہ میں وجہ شبہ اور حرفِ تشبیہ بھی موجود نہیں ہیں۔ یہ تمام باتیں تشبیہ کی بلاغت پر دلالت کرتی ہیں۔ چنانچہ اِس جملہ میں تشبیہ بلیغ ہے جو اقسامِ تشبیہ میں اعلیٰ قسم کی تشبیہ ہے۔ اِس کی تعریف یہ ہے کہ اِس میں صرف مشبّہ اور مشبّہ بہ مذکور ہوتے ہیں اور مشبّہ عینِ مشبّہ بہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ اُوپر واضح کیا گیا ہے۔ اِس جملہ میں ضمیر واحد غائب (ھُوَ) جس کا مرجع " شَهْرُ رَمَضَانَ " ہے مشبّہ ہے اور " شَهْرُ الصَّبْرِ " کا مرکب اضافی

مشبہ بہ ہے۔ وجہ شبہ متعدد ہیں اور وہ درج ذیل ہیں:۔
صبر و ثبات، ضبط و تحمل، استقلال و استقامت، ایمان و ایقان وغیرہ۔
وَهُوَ شَهْرُ الصَّبْرِ کے چھوٹے سے جملے پر آپ مزید غور کیجیے۔ اِس میں تشبیہ بلیغ کے علاوہ مزید ادبی حسن ہے اور وہ وسعتِ معنوی کا حسن ہے۔ کلام کا وسیع المعنیٰ ہونا بجائے خود حسنِ کلام، جوہر کلام اور زیورِ کلام ہے۔ اَفْصَحُ الْعَرَبِ وَالْعَجَمِ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ایک مختصر اور وسیع المعنیٰ جملہ ارشاد فرما دیا۔ اور یہ کہہ کر ہمارے اسپِ شوق کو بھی مہمیز لگا دی کہ نوافل فرائض کے ہم پایہ ہیں۔ ایک فرض ستر فرائض کے مساوی ہے۔ روزہ دار کی روزہ کشائی اور غلام و مزدور کے کام میں تخفیف گناہوں کی بخشش کا ذریعہ اور آتشِ دوزخ سے رہائی کا سبب ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ اس وسیع المعنیٰ جملہ کی معنوی وسعت کو خود سمجھیں اور سمجھائیں۔ اور اپنے مزاج و مذاق اور اپنی فکر و فہم کے بقدر اس کے اجمال کی تفصیل بیان کریں۔ یہ بھی ہمارا ہی فرض ہے کہ خداوندِ قدوس کے ارشاد کے مطابق کہ:

۱۔ وَفِي ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (المطففین ۲۶)
۲۔ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ (الحدید ۲۱)

ہم خصوصی طور پر رمضان المبارک میں عبادات کے اندر انتہائی جوش و خروش اور سبقت کا مظاہرہ کریں۔ اِبْتِغَاءَ مَرْضَاتِ یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی کوشش میں اگر ہم مر مٹیں تو بہت ہی سستا سودا ہے۔ بقول شاعر:

ع یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

پھولوں کی سیج کی طرف تو ہم عاجلانہ پیش قدمی دکھاتے ہیں اور جب وادیٔ پر خار سے گزرنے کا وقت آتا ہے تو بھگوڑے بن جاتے ہیں۔ غور کیجیے کہ سولہ (۱۶) گھنٹے کے طویل اور آتش فشاں ایام میں بھوکا پیاسا رہ کر فرائض و واجبات کی ادائیگی، نوافل کی ادائیگی، صلوٰۃ التسبیح کی ادائیگی، اوراد و وظائف کی ادائیگی، تلاوتِ کلامِ پاک اور سب سے بڑھ کر آخری عشرے کی سخت ریاضت و مشقت، صبر کی صفت کے بغیر ممکن نہیں۔

الغرض اِس جملہ میں تشبیہ بلیغ کے علاوہ معنوی وسعت کا ادبی حسن بھی موجود ہے۔

اِس ادبی حسن کو علمِ معانی کی اصطلاح میں "ایجازِ قصر" کہتے ہیں۔ ایجازِ قصر کی تعریف یہ ہے کہ کلام قلیل الالفاظ اور کثیر المعنیٰ ہو اور اس کا کوئی جزء محذوف بھی نہ ہو۔

۷۔ وَشَهْرُ الْمُوَاسَاةِ۔ یہ ہمدردی، دِلسوزی اور غمخواری کا مہینہ ہے۔

اِس جملہ میں بھی وہی ادبی محاسن ہیں جو اُوپر کے جملے میں بیان کیے گئے۔ یعنی "تشبیہ بلیغ" اور "ایجازِ قصر"۔ اور اس میں خصوصی وصف بھی ہے۔

۸۔ وَشَهْرٌ يُزَادُ رِزْقُ الْمُؤْمِنِ فِيهِ۔

یہ جملہ بھی ماہ مبارک کا خاصہ بیان کرتا ہے۔ ہم بچشمِ خود رزق کی زیادتی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ مساجد کے گوشے اور گھروں کے نعمت خانے نعمتوں سے بھر جاتے ہیں۔ ہمسایوں کے معصوم بچے افطار کی پلیٹیں لیے تواتر کے ساتھ چلے آتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا آسمان سے خوانِ نعمت اُتر رہے ہیں۔ نادار سے نادار روزہ دار کا دستر خوان بھی انواع واقسام کی نعمتوں سے بھرا ہوتا ہے۔ ابھی دستر خوان پر صرف سموسے اور پکوڑے ہی رکھے ہوئے تھے کہ چشم زدن میں سامانِ افطار سوا ہو گیا۔ نعمتوں میں طغیانی آگئی۔ وہ دیکھیے نعمتیں دستر خوان کے کناروں سے نکلی جا رہی ہیں۔ روزہ داروں کے ساتھ کچھ روزہ خور بھی شریکِ افطار ہیں۔ یہ رزاقِ مطلق کا کرمِ خاص ہے کہ روزہ خوری کے باوجود انہیں رزق مل رہا ہے۔ چاند میں روشنی آگئی اور سائرن بھی بج رہا ہے۔ روزہ دار افطار کی مسرت حاصل کر رہے ہیں۔ افطار کی مسرت وہ مخصوص مسرت ہے جو روزہ خوروں کو نصیب نہیں ہوتی۔

الغرض ازدیادِ رزق کے یہ مناظر صرف اِسی ماہ مبارک کے ساتھ مخصوص ہیں، اس کے رخصت ہوتے ہی مساجد کے گوشے اور گھروں کے نعمت خانے اس برکت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس موقع پر یعنی افطار کے بعد سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جن دعائیہ کلمات کے پڑھنے کی تلقین فرمائی ہے وہ بیشتر روزہ دار نہیں پڑھتے حالانکہ پڑھنا چاہیے۔ یہ کلمات موزوں ترین اور مختصر ترین ہیں۔ ادبیت کے اعلیٰ معیار پر ہیں۔ اِن کا یہی ادبی حسن وجمال کیا کم ہے کہ ان میں حد درجہ کی بلاغت بھری ہوئی ہے۔ وہ کلمات یہ ہیں:

ذَهَبَ الظَّمَاءُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوقُ وَثَبَتَ الْاَجْرُ (باقی برصفحہ ۴۸)

رسائل و مسائل

احترامِ رمضان

سوال :- جناب ایڈیٹر ترجمان القرآن ! روزہ رکھنا، نہ رکھنا تو کسی کی نیت پر منحصر ہے کیونکہ یہ ایک ایسی ذاتی عبادت ہے جس کا حقیقی رابطہ اللہ تعالیٰ سے ہوتا ہے۔ احترامِ رمضان کا تعلق البتہ معاشرے سے ہے۔ احترامِ رمضان کا حق کس طرح ادا ہو سکتا ہے ؟

جواب :- روزے کی فرضیت ہر صاحبِ ایمان کے لیے آمدِ رمضان پر ایک امتحانی موقع پیدا کر دیتی ہے کہ آیا اس کا ایمان اتنی جان رکھتا ہے کہ وہ خدا کے واضح احکام و حدود پر سنتِ رسولؐ کی تشریحات کے مطابق ذوق و شوق سے عمل کرے۔ یا کیا وہ برکتوں کے مہینے میں بہت بہتر اجتماعی فضا مہیا ہونے کے باوجود اپنی خواہشات پر تھوڑی سی پابندیاں نہیں لگا سکتا۔ سارا دین، ساری تہذیب، سارا اخلاق اور ساری شرافت اپنے اوپر پابندیاں لگانے ہی پر منحصر ہے۔ پابندیوں سے بھاگنے اور خواہشات کے پیچھے بگٹٹ دوڑنے کا رویہ حیوانی رویہ ہے۔ جتنا جتنا یہ حیوانی رویہ انسانوں میں پھیلتا جاتا ہے، سیاست و تمدن اور تہذیب و اخلاق کی تباہی پھیلتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جان، مال، آبرو، آزادی کسی شے کے لیے تحفظ باقی نہیں رہتا۔ خدا کے سچے دین کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسانوں کو درندوں اور چوپایوں کی پستی سے نکال کر ایمان و تقویٰ اور شرف و شائستگی کی بلندیوں پر پہنچا دے۔ اس کے لیے بنیادی عبادات اہم ترین ذریعے ہیں۔ اور ان میں سے نماز کے بعد روزہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اچھے انسان، اچھے معاشرے اور اچھے نظام کی تعمیر صرف اسی طریقے سے ہو سکتی ہے۔

روزہ انفرادی پہلو بھی رکھتا ہے، لیکن تمام مسلمانوں کے لیے ایک خاص مہینے میں فرضیت،

ایک خاص وقتِ آغاز و اختتام، اور ایک مقررہ نظامِ تراویح کے ہونے کی وجہ سے اِس میں شانِ اجتماعیت بھی ہے۔ یہ اجتماعیت فرد کو بہترین فضا مہیا کر کے روزے کی عبادت کو آسان بنا دیتی ہے۔ جو بدبخت استطاعت رکھتے ہوئے اتنی بڑی سہولتوں کے باوجود روزہ نہیں رکھتا وہ اپنا نقصان تو کرتا ہی ہے، اپنے گھر، اپنی بستی اور اپنے دائرۂ کار سے متعلق اچھے لوگوں کے لیے وبال اور مسلم معاشرے کے لیے کلنک کا ٹیکہ بن جاتا ہے۔ دینی فرض سے گریز اپنے خزانۂ ایمان میں سے چوری کرنا ہے۔ لہٰذا روزے کو انفرادی عبادت کہہ کر، اور صرف خدا سے متعلق قرار دے کر اپنے آپ کو یا دوسروں کو مغالطہ دینا درست نہیں۔

اب رہا احترامِ رمضان کا معاملہ، سو اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی بیماری یا سفر وغیرہ کسی عذرِ شرعی کی بنا پر روزہ نہ رکھ سکے۔ اور بعد میں قضا کرے یا فدیہ دے، ایسے شخص کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے ترکِ صوم کو اخفا میں رکھے۔ حتیٰ کہ بہتر یہ ہے کہ گھر کے چھوٹے بچوں کو بھی محسوس نہ ہونے دے۔ اور ایسے محتاطِ دین سے بلاوجہ دوسروں کو پوچھتے بھی نہیں پھرنا چاہیے کہ اس سے وہ لوگ بلاوجہ شرمسار ہوں اور اپنے احوال کی تفاصیل بتانے پر مجبور ہوں۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو "روزہ خور" (یا روزہ خوار) کہلاتے ہیں۔ ان سے بہ عجز و الحاح گذارش ہے کہ وہ اپنے گھر کے اندر اخفا سے اگر اپنی بہیمانہ جبلت کے پاؤں پر بوسہ دینا ہی چاہیں تو دے لیں، مگر بازاروں اور گلیوں اور پارکوں میں اپنی روزہ خواری کے جلوے دکھا کر مسلمانوں کی بستی یا معاشرے کی تذلیل نہ کریں اور روزہ رکھنے والوں کے خلاف ترکِ روزہ کی گندی فضا کا بوجھ نہ بڑھائیں۔ کاش کہ ایسے لوگ اُن معصوم بچوں سے سبق لے سکیں جو دس سال سے کم عمر کے ہوتے ہوئے گرمیوں کے دو چار روزے مکمل کر لیتے ہیں۔

اِس سلسلے میں ہمارے اسلاف کے مسلم معاشروں میں احترامِ رمضان کے باقاعدہ قانون ..... رائج رہے ہیں، بلکہ انگریز کے دَورِ غلامی میں مَیں نے خود اپنے دیہاتی علاقوں میں دیکھا کہ روزہ نہ رکھنے والے شخص کے لیے جینا دوبھر ہو جاتا تھا۔ پس آج بھی اگر ہم اپنی مملکت کو اسلام سے منسوب کرتے ہیں تو یہاں احترامِ رمضان کا مضبوط قانون رائج ہونا چاہیے، نہ یہ کہ وہ محض ایک بھونڈا مذاق بن کے رہ جائے۔

پچھلے چند سالوں میں حکومت کی طرف سے احترامِ رمضان لازم کیا گیا تو اس کے نمایاں مفید اثرات پڑے۔ مگر دوسری طرف پکوڑے اور کباب بنانے والوں اور پھل بیچنے والوں، تیز کنارِ راہ کے ہوٹلوں نے جس طرح چادریں تان تان کر اور خیمے لگا لگا کر ڈرامے رچائے رکھے ہیں وہ ایک مضحکہ انگیز کارروائی تھی۔ اس معاملے میں درست تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔

احترامِ رمضان کا معاملہ صرف کھانے پینے تک ہی محدود نہیں، برکتوں، رحمتوں اور بخششوں والے اس مہینے میں ناجائز مناظر اور ناپسندیدہ آوازوں اور گندے جذبات سے ماحول کو پاک ہونا چاہیے۔ لازم ہے کہ ہمارا ریڈیو اور ہمارا ٹیلی وژن قوم کو فضول گانوں اور لچر موسیقی اور بیہودہ ڈراموں اور رقص اور رامش و رنگ سے قوم کی تواضع نہ کریں۔ اسی طرح اخبارات بھی جنسی لحاظ سے ہیجان انگیز تجلیات تصاویر میں نہ لائیں۔ اور نہ اداکاروں اور موسیقاراؤں اور کرکٹروں کے انٹرویوز میں میاں بیوی دونوں کو سامنے بٹھا کر ازدواجی زندگی کے چٹخارے گھروں کے خلوت کدوں سے نکال کر ان کی اخباری ”چاٹ“ بنائیں۔ بصورتِ دیگر روزہ رکھنے والی اکثریت کے دل و دماغ میں بھی نفسانیت ڈنک لگاتی رہنا روزہ خوری سے بھی بڑا ستم ہے۔ اس زمانے میں تو خصوصیت سے دیواروں کو بھی گھٹیا اشتہارات اور ذلیل تصاویر سے پاک رکھنا چاہیے۔

پس افراد، حکومت اور ذرائعِ ابلاغ سب کو مل جل کر یہ کوشش کرنی چاہیے کہ مسلمان قوم میں رمضان کے شایانِ شان فضا پیدا کی جائے۔ یہ مہینہ نمازوں، روزوں، تراویح، قرآن پڑھنے، صدقہ کرنے اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافیاں مانگنے کا مہینہ ہے۔ اور یہ مہینہ ہے جس میں ہمیں اپنی دردناک حالت کا احساس کرنا چاہیے کہ اندرونی طور پر ہم خیانت اور بدکاریاں کرتے اور لڑتے مرتے ہیں۔ اور باہر سے کئی طاغوتی قوتوں کی سازشوں نے ہمیں جکڑ رکھا ہے۔ بلکہ یہ ایک غیر محسوس طرز کی نہایت ہی نشہ آور زہریلی غلامی ہے جس کا ہم شکار بن چکے ہیں۔ یہ لمحہ خدا سے بغاوت کر کے جھنگڑے ڈالنے اور بڑکیں مارنے کا نہیں ہے، بلکہ وقت وہ آگیا ہے کہ حاکمِ کائنات کے سامنے گڑگڑا کر آنسوؤں کی زبان میں ہم معافی

مانگیں اور امن و سلامتی کی بھیک مانگیں [1]

رمضان ہی میں اوّلین معرکۂ بدر سرہوا تھا، رمضان ہی میں پاکستان بنا اور اب رمضان ہی میں ہمیں اللہ تعالیٰ سے ایمان، ہدایت حقیقی آزادی اور نفاذِ اسلام کی دُعا کرنی چاہیے۔

(نعیم صدیقی)

---

[1] یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ فتنۂ انکارِ ختمِ نبوت کے علمبردار اور داعیانِ نبوتِ باطلہ یعنی قادیانیوں کو ایک بار پھر نئے دورِ حکومت میں سرافرازی کے مواقع مل رہے ہیں۔ ان کے ممنوع شدہ نقیب جریدے کو از سرِ نو اشاعت کا موقع ملا ہے اور دوسری طرف وہ مباہلے کے چیلنجوں کا طوفان اٹھانے کے ساتھ پاکستان میں سالانہ جشنِ مسرت منانے کے اعلانات اور انتظامات کر رہے ہیں۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ کا یہ اقدام قابلِ تحسین ہے کہ انہوں نے جشنِ مجوزہ کی ممانعت کر دی ہے۔ مگر اصل اور وسیع تر ذمہ داریاں وفاقی حکومت کی ہیں۔ کیونکہ اُدھر سے اگر دستِ شفقت قادیانیوں کے سر سے اٹھا لیا جائے تو پھر ان کے فتنہ و سازش کے سارے محل گر جاتے ہیں۔

رمضان میں اس فتنہ کی روک تھام کے لیے جو قدم بھی اٹھایا جائے وہ باعثِ برکت ہوگا۔ بصورتِ دیگر احترامِ رمضان کا حق ادا نہ ہو سکے گا۔

سیرت سرورِ عالمؐ میں ایک تصحیح

سیرت سرورِ عالمؐ جلد ا میں صفحہ ۶۸۲ اور ۶۸۳ پر لفظ فارقلیط کے سلسلے میں بحث ہے۔ ص ۶۸۲ کی سطر (نیچے سے) ۶ اور ۷ میں جس ترتیب سے انگریزی الفاظ PARACLETUS اور PERICLYTOS آئے ہیں وہ بحث کے لحاظ سے صحیح ترتیب ہے۔ مگر ص ۶۸۳ پر سطر (نیچے سے) ۸ میں ان دونوں لفظوں کے ہجے بے اُلٹی جگہوں پر لگا دیئے گئے ہیں۔ آئندہ ایڈیشن میں ادارہ ترجمان القرآن اس کی اس کی تصحیح کرا دے گا۔ موجودہ کتب میں قارئین خود تصحیح کر لیں۔ (ہم توجہ دہانی پر بشارت علی صاحب کراچی کے ممنون ہیں)۔

(ادارہ)

مطبوعات

غالب (ششماہی) مرتبین: مختار زمن و مشفق خواجہ۔ بہ اہتمام ادارۂ یادگارِ غالب، غالب لائبریری، ناظم آباد نمبر ۲۔ کراچی نمبر ۱۸ صفحات: ۳۸۲۔ قیمت: نامعلوم۔

یہ بڑے معیار کا ادبی و تحقیقی رسالہ ہے۔ مرتبین بڑے مرتبے کے ہیں۔ سارے مندرجات پر گفتگو ممکن نہیں۔ تفصیلی اظہار تو خارج از بحث ہے۔ دیہاتی فضا اور جنگل اور شکار، کسانوں کی بولی اور گھوڑوں کی نسلی خوبیوں کے عکس پیش کرنے (اور جنسیات بھی) میں ابوالفضل صدیقی کا اختصاص ہے۔ ایک واقعاتی پلاٹ اور واقعات کی تیز رفتار حرکت میں سنگھ بابو کا دلچسپ کردار نمایاں کر کے ایسے انسانیت پرورانہ پلے پر ختم کیا کہ کیا کہنے۔ میرزا ظفر الحسن کا خاکہ یوسف ناظم نے یوں پیش کیا ہے کہ مرزا کو نہ جاننے والا بھی جان لے کہ وہ ایسے تھے۔ اسی طرح مشرف احمد فاروقی نے ابوالفضل صدیقی کی لفظی تصویر کھینچی ہے۔ اور ان کی کہانیوں سے یہ سوال اخذ کیا ہے کہ یہ جنگل کون کاٹے گا جس میں انسانوں کا شکار ہوتا ہے۔ احمد ہمدانی نے شاعری کے تین دبستانوں کی عجیب ناقابلِ فہم تقسیم کی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ رسالے کا نام غالب اور غالب پر کل ۴ مقالات ہیں (مجموعی ۳۵ صفحات)۔ بخلاف اس کے فیض احمد فیض پر دس[1] مقالات و مضامین (۱۳۶ صفحات[1]) ہیں۔ پھر اس سلسلے کے جس عنوان سے بات شروع ہوتی ہے "اقبال، فیض اور ہم" اس میں اگرچہ آلِ احمد سرور صاحب نے دونوں کے امتیازات اور مماثلتوں کا بیان کرتے ہوئے احتیاطیں بھی برتی ہیں مگر رسالہ اور ایک خاص حلقۂ فکر دماغوں میں لائن یہی بنانا چاہتا ہے کہ پہلے غالب، اس کے بعد اقبال اور اس کے بعد فیض۔ یہ ایک ہی سلسلۃ المذہب ہے۔ حالانکہ اقبال کے بعد تین شاعر ایسے ہیں جو اقبال سے فکری ہم آہنگی بھی رکھتے ہیں اور ان کا مقام بھی ہے۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری، احسان دانش اور ماہر القادری۔ کیا ان کے ساتھ بھی انصاف برتا گیا؟ فیض قابلِ توجہ شاعر سہی، مگر اقبال کے نوا آشناؤں

---

[1] کہیں فیض سیمینار، کہیں فیض میلہ اور کہیں رسالہ غالب کا بے نام "فیض نمبر"

کے ذہنوں میں اس شخص کو مسیح بنا کر تونہ ٹھونسا جائے۔ [1]

اب ذرا ان نکات کو لیجیے کہ اقبال کے ہاں فکر کا محور مغرب ہے (حالانکہ حقیقتاً اسلامی ملت و تہذیب اور اس کے لیے تحریکِ احیا ہے۔ ن۔ ص) اور فیض کے ہاں فکر کا محور تہذیب ہے (تاریخ کی مادی تعبیر سے پیدا ہونے والی تہذیب۔ ہ۔ ص)۔ کیرنن نے فیض کو "کلچرل مسلمان" کہا ہے۔ یہ مسلمان کی کونسی قسم ہے؟ کیا ہی اچھا ہوتا کہ ہمارے خواجۂ مکرم مختار زمن صاحب سے کہہ کر محترم سرفراز اقبال کے رشحاتِ عالیہ کا خلاصہ بھی اپنے ہاں دے دیتے۔

دو تحریریں صادقین کی درست تصویر سامنے لاتی ہیں۔ دوسرے معزز حضرات کی وقیع نگارشات پر گفتگو کرنے کے معنی یہ نہیں کہ وہ قابلِ قدر نہیں۔ " ورق کی تنگ دامانی سے فریاد!"

متاعِ کارواں | مدیرِ اعلیٰ قاضی قادر بخش قریشی ایم اے۔ پیش کش: گورنمنٹ نارمل سکول خان پور

یہ اسکول کا میگزین ہے، مگر نہ صرف طباعتی خوبیوں کا آئینہ دار ہے بلکہ بہت سے معروف دانشوروں اور نوجوان اساتذہ و طلبہ کی کاوشوں کا ایک دلآویز مجموعہ ہے۔ اِس میں غالب حصہ تعلیم سے متعلق مضامین کا ہے۔ مگر ادبی نگارشات مثلاً افسانہ، طنز و مزاح اور شاعری کے لحاظ سے بھی مالا مال ہے۔ خصوصاً میں نوجوان قلم کاروں کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ مجھے اِس مجموعے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں نہ صرف متعدد مضامین دینی مباحث پر مشتمل ہیں، بلکہ مجموعی طور پر اسلامی رُوح غالب ہے اور فحش جنسیات کے گند اور دیگر لغویات سے خالی ہے۔ متاعِ کارواں کو بہم کرنے والے تمام دانشور، اساتذہ و طلبہ اور خصوصاً چوہدری محمد حسین منیجر/نگران مستحقِ تبریک ہیں۔

---

[1] اب تو شاعری کی مثلث کے تین زاویے ہیں فیض، فہمیدہ اور فراز۔ غالب لائبریری کا نام بھی فیض لائبریری ہونا چاہیے۔

تذکرہ حضرت سید صاحب بانسوی از جناب مفتی رضا انصاری فرنگی محلی - ناشر: ادارۂ تحقیقاتِ افکار و تحریکاتِ ملی، ۱/۹ علی گڈھ کالونی، کراچی نمبر ۸۰۰ ۷۵ - صفحات: ۲۲۴ - کھلی کھلی طباعت، مجلد مع رنگین سرورق، قیمت: -/۴۵ روپے -

ایک بزرگ شخصیت کے حالات بڑے سبق آموز ہیں - ہم نے اکثر صفحے دیکھ ڈالے، تصوّف کی دُنیا میں کراماتی کہانیاں بہت چلتی ہیں اور ان کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے - مگر انبیاء کے معجزے باوجود یکہ عظیم تر ہوتے ہیں، وقتی تقاضے پورے کرنے کے بعد ان کا ریکارڈ تو رہتا ہے، مگر فی نفسہٖ ان کو روحِ استدلال بنا کر دعوتِ انبیاء کو نہیں پھیلایا جاتا - یہاں بھی کرامات نگاری خاصی ہے - ایک معجزاتی کراماتی قصّہ " محبوبِ بے کمر کا پٹکا " کے عنوان سے ایک لمبی گفتگو ہے - ہم اس کے خلاف کوئی کلمہ نہیں کہتے - مگر دعوتِ اسلام کے لیے یہ چیزیں مستقل دلائل کی حیثیت نہیں رکھتیں - ملا محمد رضا کی غلامئ مرشد کی داستان بڑی دلچسپ ہے - " گھوڑے کا سامان سر پہ رکھ کر سرِ بازار دوڑتے جاتے تھے -" پھر وہ املی کے درخت کے نیچے کنہیا اور گوپیوں کا مشاہدہ - تصوّف کا یہ کمال تو تسلیم کہ آدمی ورطۂ حیرت میں پڑ جاتا ہے - پیش لفظ میں ہے کہ کتاب و سنّت کے تزکیۂ نفس کے بہترین نمونے صوفیۂ کرام ہی کی سیرتوں میں نظر آتے ہیں - ساتھ ہی یہ ارشاد کہ تصوّف کی دُنیا ایک الگ اور وسیع دُنیا ہے، الگ علم ہے - روحِ اخلاص، سلامتئ قلب اور بے ریائی و عاجزی کے درس خود اسلام ہی کے اندر ہیں - اور بہ یک وقت تلوار بھی چلائی جاتی ہے، ترازو بھی ہاتھ میں لی جاتی ہے اور خدا سے بھی تعلق جوڑا جاتا ہے - یہ ہے بڑی کرامت - اسلام سے الگ کوئی مستقل علم ہو تو محبانِ اسلام اُسے کیا کریں - دیکھیے! ایک کردار ہے " مجذوب " کا، جس کی شان یہ بیان ہوئی کہ " جو حقیقت سے باخبر، اور تمام سے بے خبر " کیا ایسا کوئی کردار قرآن و سنّت میں مذکور ہے اور اس کے بنانے کا اہتمام کیا جائے - ساری اُمّت کے لوگ " مجذوب " ہو جاتے - پیش لفظ میں مادّی طاقت سے بے نیاز رہنے کا ذکر ہے - اگر رُوسی حملے کے وقت مجاہدینِ افغانستان مادّی ذرائع سے رو ٹھ کر بیٹھ رہتے اور کلاشنکوف اور سٹنگر میزائیل کو استعمال نہ کرتے تو پھر وہاں صرف مجذوبیت ہی رہ جاتی - خود یہ کتاب، اس کی اشاعت، اس کی قیمت سب کچھ مادّی ہے -

غرضیکہ سید شاہ عبدالرزاق بانسوی کی بزرگی کا احترام کرنے کے باوجود میں تصوّف کے گورکھ دھندے کو نہیں سمجھ سکا -

اقبال ۔ ایک صوفی شاعر از جناب ڈاکٹر سہیل بخاری ۔ ناشر: مکتبۂ اسلوب، پوسٹ بکس نمبر ۲۱۱۹، کراچی نمبر ۱۸ ۔ صفحات: ۳۸۰/ روپے، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۴۵/ روپے

اقبال کیا تھا اور اس نے کیا سوچا اور کیا کہا؟ اس سوال کے جواب میں ڈاکٹر محمد یوسف صاحب سے لے کر پروفیسر جگن ناتھ آزاد تک سیکڑوں افراد نے کتابوں اور مقالوں کے انبار لکھ دیئے ۔ مگر سوال ہر وضاحت کے بعد اور اُلجھ گیا ۔

اصل میں اقبال کی ذہنی ساخت اور فنی تشخص کے بنانے میں اگرچہ فلسفے، تصوف، تاریخ اور دینِ برحق کے سبھی عناصر شامل ہیں، مگر ایسا نہیں ہے کہ اس کا کوئی پائیدار مقام نہ ہو، بلکہ اس کی فکر ایسی غیر شیرازہ بند ہو کہ مختلف اصحاب اسے متذکرہ مؤثرات میں سے ہر جانب الگ الگ کھینچیں ۔ یہاں تک کہ سیکولرازم کا علمبردار بھی اقبال اور اشتراکیت کا داعی بھی اقبال ٹھہرے ۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اس کی مرکزی فکر اور منتہائے مقصود، اس کا جہانِ مطلوب، اس کا تصوراتی انسان، اور اس کا منتخب کردہ جادۂ انقلاب کیا ہے ۔ اصطلاحات، شخصیتیں، واقعات، تعلقات، خط و کتابت، شاعری کے صریح مباحث، نثر کے مطالب مجموعی طور پر کس محور کے گرد گھومتے ہیں ۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ ایک دور میں مطمحِ اسلامی یا مسلم قومیت کے جذبے کے ساتھ اس کے ہاں پُراسرار قسم کا وحدت وجودی تصوف ملتا ہے، مگر بالآخر اس کا اصل پیغام قرآن کے عملی ظہور اور حکومتِ الٰہی اور مردِ مومن کے پیرائے میں ہمارے سامنے آتا ہے، اور پھر وہ تصوف کا صرف وہ رنگ اختیار کرتا ہے، جو اخلاص، بے ریائی، عدم تضادِ قول و فعل اور عبادت کے ساتھ خدمت کا متقاضی ہے ۔

مگر ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر سہیل بخاری صاحب کے فرمودات زیادہ اہم ہوں، کم سے کم انہوں نے تصوف اور اس کے احوال و مقامات اور اصطلاحات کو خوب واضح کیا ہے، لیکن ان کی توجہ فارسی کلام پہ مرتکز رہی ہے ۔ حالانکہ اُردو کلام اور نثر تحریریں اور خطوط بہت اہم ہیں ۔ خود فارسی میں بھی دوسرا رُخ اور دوسرا طریقِ توضیح سامنے آنا چاہیے ۔ اسرار و رموز میں جستہ جستہ اشعار کو چھانٹ لینا اور بات ہے اور مختلف مباحث کو عنوان وار پورا درج کرنا اور بات! افسوس ہے کہ مندرجات پر بحث کرنا ممکن نہیں ۔

اسلام یا ملّا ازم؟ از جناب اصغر علی گھرال ایڈووکیٹ ہائی کورٹ - ناشر: مکتبۃ الوکیل، گجرات - صفحات: ۲۵۶ - مجلد مع گردپوش - قیمت: ۱۰۰/- روپے

میں نے اس کتاب کو بڑی محبت سے پڑھا، مگر افسوس ہے کہ شرعی قوانین کے جن موضوعات و مسائل پر علمی تیاری کے ساتھ سنجیدہ بحث کرنی چاہیے تھی، انہیں مذاق اور لطیفہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ سامراجی یورش کے وقت دینی گروہ کی مزاحمت پر برافروختہ ہو کر جو گالی اہلِ دین کے انگریزوں نے ایجاد کی تھی، افسوس ہے کہ دشمن کی اس چھوڑی ہوئی ہڈی کو اٹھا لیا گیا ہے اور پڑھے لکھے معقول لوگ اسے چٹنی بنائے ہوئے ہیں۔ گھرال صاحب! گالی ہی دینی ہو تو اپنی ایجاد کردہ لایئے، تاریخ کے کباڑ خانے سے دشمن کے پرانے ہتھیار تو چوم کے نہ اٹھالیجیے۔ دین کے بہت سے خادم ایسے ہیں جو ملّا کہلا کر بھی ترکِ دین نہ کریں گے۔

جب کبھی آپ علمی بحث سامنے لائیں گے تو ہم پوری نیازمندی سے اس سے استفادہ کریں گے۔

تصوف - ایک تجزیاتی مطالعہ از جناب ڈاکٹر عبیداللہ فراہی - باہتمام: ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی - پان والی کوٹھی - دودھ پور - علی گڑھ - ۲۰۲۰۰۱ (انڈیا) صفحات ۲۰۰ - قیمت آرٹ کارڈ کے سرورق کے ساتھ ۲۵/- روپے - مجلد: ۳۵/- روپے -

یہ کتاب ایسی ہے کہ فی نفسہٖ تصوف اور اس کے مفہوم یا ماہیت پر روشنی فراہم کرتی ہے - سرسری مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ جملہ موضوعاتِ کتاب کے تحت ٹھوس معلومات اور حوالے اور آیات و احادیث درج ہیں - مختلف نقطہ ہائے نظر اور ان پر تبصرہ خوب ہے - فاضل مؤلف کے بقول اردو میں تصوف کی تفہیم و تشریح میں سب سے بڑی اتھارٹی مولانا اشرف علی تھانوی کی تھی - بعد کے متعدد فاضل اصحاب کا بھی ذکر ہے - دو ایک جملے یہاں درج ہیں:

اہلِ تصوف کہتے ہیں کہ "تصوف حال ہے، قال نہیں ہے"۔ لیکن جب وہ اپنے "حال کا بیان یا دعویٰ کرتا ہے تو قال کے دائرہ میں آجاتا ہے"۔ یہاں آکر "ہر وہ بات جو خدا اور انسان کے تعلق سے کہی جاتی ہے، مذہب جائز طور پر وہاں اپنا دخل رکھتا ہے"۔ "تصوف میں ایک ساحرانہ جذب و کشش ہے"۔ یہ قابل قدر کتاب ہے -

اسلامی احکام اور ہنگامی حالات | از جناب رانا صابر نظامی - ناشر: صدیقی پبلیکیشنز، ۲۹-اے ریواز گارڈن، لاہور - قیمت: تیس روپے -

بنیادی نقطہ نظر اسلامی ہے - حالات کی تبدیلی کے ساتھ احکام شریعت کی اجتہادی تعبیرات میں جو فرق آتا رہا، اُسے مختلف مقننین و فقہاء کی بحثوں اور خلفائے راشدین کی قائم کردہ عملی مثالوں کی مدد سے بیان کیا گیا ہے۔

بعض مقامات میں جہاں مؤلف کے طریقِ فہم یا جزوی نقطہ نظر یا اجتہادی مشوروں پر بحث اُٹھانے کو جی چاہتا ہے، مگر اتنی بڑی تحریر کے لیے گنجائش کہاں؟ بس اتنا کہنا کافی ہے کہ صابر نظامی صاحب کی اس کوشش میں خیر غالب ہے۔

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کیسے ہو؟ | از جناب محمد موسیٰ بھٹو - ناشر: سندھ نیشنل اکیڈمی، پوسٹ بکس نمبر ۲۵۸ - حیدر آباد (سندھ)

محمد موسیٰ بھٹو ایک بیدار دل نوجوان ہیں، کچھ کچھ ملت کے لیے سوچتے رہتے ہیں اور دینی کام کے لیے اشارے فراہم کرتے رہتے ہیں - یہ کتاب ایک اہم موضوع پر چند اکابرینِ دین وملت کے مقالات کا ایک مجموعہ ہے - اصحابِ مقالات میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا وحید الدین خاں، (۲ مضامین)، مولانا محمد تقی امینی (دو مضمون)، ڈاکٹر محمد رفیع الدین (۲ مضمون) محمد موسیٰ بھٹو (۳ مضمون اور پیش لفظ)

یہ مجموعہ بہرحال سرمایۂ علم وبصیرت ہے - مگر اس طرح کے مجموعوں سے کوئی بڑا کام نہیں ہو سکتا - اگر ان کو جمع کرنا تھا تو پہلے ہر ایک کی فکر کے متعلق ایک تلخیصی مقالہ دیانت دارانہ حوالوں کے ساتھ تیار کرنا تھا، یا سب کے متعلق موزوں افراد سے تیار کروانا تھا یا کم سے کم ہم آہنگی فکر رکھنے والوں کی باتوں کو اکٹھا کر کے کوئی نتیجہ نکالا جاتا - موجودہ صورت تو ٹھواری جیسی ہے کہ کھیت سے کھیت بلاتا چلا جائے -

یہ بالکل صحیح ہے کہ "پائیدار تبدیلی نفسی تغیر کے ذریعے برپا ہوتی ہے" "یا قومیں اخلاق وکردار اور ایمان واعتقاد کے ذریعے ہی زندہ رہتی ہیں" - (پیش لفظ) ان چیزوں کے ساتھ حرکت یا تحریکیت یا انقلابیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے - بہرحال بھٹو صاحب کی یہ کوشش ومحنت قابلِ قدر ہے -

تحریکی کارکن رزم گاہِ حیات میں | مرتب: اختر حجازی - ناشر: شفیق الاسلام فاروقی - حرا پبلیکیشنز - ۲/۱۴ فضل الٰہی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۱۳۶ ٹائیٹل آرٹ کارڈ۔ قیمت ۱۵/۱۶ روپے۔

حافظ محمد ادریس کے دیباچے کے ساتھ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ، پروفیسر غلام اعظم، مولانا معین الدین خٹک مرحوم، ڈاکٹر نذیر احمد شہیدؒ، سید اسعد گیلانی، پروفیسر خورشید احمد کے مقالات اور راقم ناچیز کا بھی ایک مضمون اس مجموعے میں شامل ہے۔

کام کرنے والوں کے لیے قرآن خود بڑا سرچشمۂ نور ہے۔ حدیث ایک فانوس ہے۔ صحابہؓ کی زندگیاں روشن ستارے ہیں۔ تابعین اور تبع تابعین کے علمائے اکابر کے کیے ہوئے کام سیکڑوں چراغ ہیں۔ اور پھر دورِ آخر میں مولانا مودودیؒ جیسے صاحبِ دل انقلابی مفکر اور ان کے مدرسۂ نظر میں تیار ہونے والے علما اور دانشور جتنا وسیع کام تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کی رہنمائی کے لیے کر چکے ہیں، اُسے اگر لوگ توجہ سے پڑھیں اور استفادہ کریں تو انہیں درسِ حکمت و عمل بھی ملے اور جادۂ کار کے سارے نشیب و فراز بھی دکھائی دینے لگیں۔ یہ مجموعہ اسی غرض کے لیے تیار کیا گیا ہے۔

اب اگر پڑھا ہی نہ جائے، توجہ ہی نہ دی جائے، سبق ہی اخذ نہ کیا جائے اور کسی شخص کے اندر کام کرنے کا ارادہ ہی نہ ہو تو ایسے مجموعے تو کیا، دل پتھر ہو جائیں تو تفسیریں اور احادیث بھی جونک نہیں لگا سکتے۔ اِس مجموعے کی کسوٹی پر قارئین اپنے آپ کو پرکھیں کہ ان کے دل ایک لفظ احساس ہیں یا پتھر کی سِل۔

مسلمان عورت کے حقوق | از جناب سید جلال الدین عمری۔ ناشر: ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ۔ یوپی۔ ۲۰۲۰۰۲ - (انڈیا)۔ صفحات: ۲۰۰۔ کاغذ اور طباعت خوبصورت۔ قیمت: ۲۰/- روپے۔

مولانا سید جلال الدین صاحب بھارت میں تعلیمی، علمی، فقہی اور ادبی لحاظ سے ایک مقام رکھتے

ہیں۔ عورت کا مسئلہ تو اب صرف پیش پا افتادہ ہی نہیں بلکہ آنکھوں میں گھسا آ رہا ہے۔ ایک طرف تو جاہلیتِ قدیمہ کے اثرات نے اسلامی احکام کے ساتھ رَل مِل کر عورت کو عجیب چکروں میں ڈال رکھا ہے، دوسری طرف مغرب کی عالمگیر ملحدانہ تہذیب نے عورت کو اپنی ناچتی کٹھ پتلی بنا کر ملت کے لیے چیلنج بنا دیا ہے۔ اِن حالات میں دینِ برحق سے تعلق رکھنے والے حساس مفکرین اسلام کا متوازن نقطۂ نظر پیش کر رہے ہیں۔ سید جلال الدین عمری صاحب نے دینی ہدایات کی روشنی میں عورت کے حقوق و فرائض کا بیلنس درست کرنے کی کوشش کی ہے۔ عورت کے موضوع سے متعلق جو مختلف مباحث آج کل سامنے آئے ہوئے ہیں۔ مثلاً آزادیٔ نسواں، مرد کی قوامیت، پردے کی بندشیں، جدید حالات میں عورت کا معاشی مسئلہ، مہر، تعددِ ازدواج، طلاق، خلع، عورت کے حقِ وراثت، قصاص، دیت، شہادت، سیاسی قیادت وغیرہ پر بحثیں کی گئی ہیں۔

سورج سمندر | مجموعہ کلام جمال قریشی۔ ناشر: اقبال مرزا۔ ملنے کا پتہ: جمال قریشی، جمال منزل، جمال پورہ، نانگڑہ والا، احمد آباد، گجرات (انڈیا)۔ صفحات: ۱۲۰۔ کاغذ طباعت خوب۔ مجلد مع رنگین گرد پوش۔ قیمت /۳۰ روپے۔

جمال قریشی نے وقت کے مختلف مراحل طے کرنے کے باوجود شاعری میں رنگ و تازگی کو برقرار رکھا ہے اور احمد آباد کی آفات کے مناظر کا کرب انھوں نے فکر میں جذب کیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہم نے گجرات کے بازار میں آ کر دو تیرا — سکہ اس طرح چلایا ہے کہ جی جانے ہے
سورج تو تیرے بعد بھی نکلا اسی طرح — لیکن ہمارے گھر میں اُجالا نہ ہو سکا
جمال اکثر شبوں کی خامشی میں — مرے اندر کا کھنڈر بولتا ہے
دل کی وادیوں میں اب گرد تک نہیں اُڑتی — قافلے خیالوں کے باادب گزرتے ہیں

جمال صاحب کے اظہار میں ندرت ہے۔ غموں کے بوجھ تلے آئے ہوئے خیالوں میں بھی شگفتگی ہے۔ ماحول ان کے کلام کے پردے میں باتیں کرتا ہے، جمال صاحب کا اپنا مخصوص رنگ بھی جابجا جھلکتا ہے اور اسلامی قدروں کی جھلملاہٹ بھی ہے۔

جہادِ حرف | مجموعۂ کلام از عزیز بگھروی (بھارت)۔ ناشر: ادارۂ ادبِ اسلامی ہند، ۲۴۴۸ بارہ دری، بلّی ماراں، دہلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا) صفحات: ۱۴۴۔ کاغذ و طباعت خوبصورت جلد مع رنگین گرد پوش۔ قیمت: ۲۵/- روپے۔

ہم تو تصور ہی نہیں کر سکتے کہ ایسی کتاب ۲۵/- روپے میں مل سکتی ہے۔

عزیز بگھروی اتنے اچھے شاعر ہیں کہ وہ اس کتاب کے پہلے ہی مجید سے ایک نوٹ حاصل کر چکے ہیں، جو گرد پوش کے آخری صفحے پر درج ہے۔ شاعروں کے ساتھ ان صفحات میں انصاف کرنا بڑا مشکل ہے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے ؎

شہرِ خوباں کا ہر اک چہرہ ہے معصوم صفت — کس سے منسوب کروں زخمِ جگر کا رشتہ
میرا قاتل مرا اپنا کردار ہے — کس کو الزام دوں خودکشی کے لیے
ابھی نہ بند کرو، مقتلوں کے دروازے — ابھی اک اور مسیحا یہاں سے گزرے گا

تبصرہ کے لیے حفیظ میرٹھی کے یہ الفاظ کافی ہیں:

"نظریہ کی صحت کے ساتھ اسلوب کی شگفتگی، زبان کی شستگی اور خوش آہنگ الفاظ سے آراستہ یہ شعری مجموعہ"!

(بقیہ نبیؐ اکرمؐ کا خطبۂ رمضان المبارک)

اِنْ شَآءَ اللّٰہُ تَعَالٰی۔

ترجمہ: پیاس رخصت ہوگئی (بجھ گئی)، رگیں تر و تازہ ہو کر پھول گئیں اور روزے کا اجر و ثواب انشاء اللہ تعالیٰ یقینی ہوگیا۔

(باقی)

(بقیہ اشارات) (بیوروکریسی) سے مسلسل ملاقاتیں کر کرکے ایک تو حکومتی اُمور اور سیاسی ہیر پھیر کو سمجھنا چاہیے، دوسرے ان تک کسی نہ کسی شکل میں دین کا پیغام بھی پہنچانا چاہیے، بلکہ پہنچاتے رہنا چاہیے۔ ان کے ساتھ شعبۂ پارلیمانی اُمور کو یہ ضروری تعاون بہم پہنچانا چاہیے کہ جو بھی مسائل ایوان میں آئیں یا آنے والے ہوں اُن پر حقائق و واقعات کے پہلو سے بھی اور اسلامی رہنمائی کے پہلو سے بھی اور ضرورت ہو تو بیرونی نظائر کے لحاظ سے بھی فوری طور پر مختصر لٹریچر لیف لیٹ وغیرہ تیار کر کے پھیلا دینے چاہئیں۔ بیشتر لوگ خالی الذہن ہوتے ہیں۔ اور جب ان کو مواد ملتا ہے تو اس کو سامانِ تقویت سمجھتے ہیں اور کچھ نہ کچھ اثر نظریاتی طور پر بھی لیتے ہیں، کیونکہ ان کی اکثریت مسلمانوں ہی کی ہے۔

اچھا پارلیمنٹرین وہ ہے کہ سیاسیات، دستوری مسائل، ایوان کے ضابطۂ کارروائی اور مُلکی اور غیر مُلکی پارلیمنٹوں کی رپورٹوں کا گہرا مطالعہ رکھنے کے ساتھ اپنے مُلک کے ہر شعبے کے ضروری اعداد و شمار اور سرکاری شائع شدہ مواد پر نظر رکھے۔

اب ذرا پیچھے پلٹ کر یہ بات تازہ کر دی جائے کہ انتخابات جیتنے کے لیے عوام کی ہر پسندیدہ چیز کو اختیار کر لینا، یا حریفانِ مقابل جو جو حرکتیں اور ہتھکنڈے اختیار کریں، وہی وہ بالکل شاگرد بن کر قبول کر لینا، کارکنانِ تحریک کی اُس شخصیت کو توڑ دے گا جو برسوں میں ایک خاص سانچے میں ڈھلی ہے۔ وہ پہلے تو دو پیمانے اور دو سرے کردار ادا کریں گے، ایک اُصولی، دوسرے انتخابی۔ بعد میں وہ ہنگامہ آرائی و ہنگامہ پسندی کے سہل راستے کی طرف لڑھک جائیں گے۔ یہ واضح ہے کہ مروجہ انتخابی طور طریق اور ہمارے اُصول و اخلاق میں کچھ قطعی فرق ہیں۔ یہ فرق پہلے ہماری شخصیتوں کو اور پھر جماعت کو دو حصوں میں بانٹ دیں گے۔ اِس سلسلے میں انتہائی احتیاط ضروری ہے۔ فی الحقیقت جہاں کہیں ہمارا ٹھوس بنیادی دعوتی اور تنظیمی کام زیادہ ہوتا ہے۔ وہاں اسی کے تناسب سے انتخابات میں وقتی حامیوں کی تعداد بھی ووٹ دینے کے لیے اکٹھی ہو جاتی ہے اور جہاں کام نہ ہو، وہاں آپ ہزار تصویریں بنوائیں، فضول گیتوں کے کیسٹ بجوائیں، سخت نکیلے نعرے استعمال کریں، جھنڈے لہرائیں، کامیابی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اصل زور اصل کام پر دینا چاہیے اور انتخابات کے انعقاد سے ۶ ماہ قبل وہاں کام کو انتخابی نہج

پر ڈال دینا چاہیے ، مگر قدم قدم پر خدا پرستانہ کردار کو مستقیم رکھ کر اور ذکر و نوافل کا اہتمام کر کے ، اور ہمیشہ یہ شعور تازہ کرتے ہوئے کہ ہم صرف ممنونانِ انتخاب نہیں ہیں، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انقلابی شاہد و نقیب ہیں ۔ اور حضورؐ کے جادۂ سنّت سے انحراف نہیں کریں گے !

یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ آپ دل سے یہ سمجھ لیں کہ اگرچہ مسلمانوں کی ایک آزاد مملکت میں تغیر کی انتخابی راہ کے کھلے ہونے کی صورت میں اس کا استعمال ضروری ہے، لیکن اوّل تو موجودہ ماحول اور افرادِ معاشرہ کے احوال اور جمہوریت کے غلط تصورات کی وجہ سے ہمارے لیے ایمان و اخلاق کو باقی رکھ کر کوئی بڑی قوت حاصل کرنا تا دیر ممکن نہیں ہے ، اور اپنی عددی کمزوری کی وجہ سے طرح طرح کی قوتوں سے مختلف انداز کے اتحاد قائم کرنے اور توڑتے رہنے سے بھی ہمارے تحریکی شعور و کردار کا نقصان ہوتا رہتا ہے اور اگر وزارتِ عظمیٰ اور اقتدار کی باگیں مروجہ دستور اور قواعد اور موجودہ بیورو کریسی کے ہوتے ہوئے مل بھی جائیں تو بھی ہماری مطلوبہ بھرپور تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی ، بلکہ "کمپرومائزز" کرنے ہوں گے اور قدم قدم پر وہی " بڑی برائی اور چھوٹی برائی " کا جھمیلا چلتا رہے گا جو انقلابی عزیمت کا قاتل ہے ۔ یہ ہم نہیں جانتے کہ مستقبل کی تاریخ ہماری مساعی کے آخری بڑے نتیجے ، یعنی اسلامی انقلاب کو کیا ایک کدھر سے کونسا رستہ دے گی ، مگر یہ بہر حال یقینی ہے کہ ہماری موجودہ سیاسی ، انتخابی اور پارلیمانی مساعی اسی طرح تیاریٔ انقلاب کا لازمی حصہ ہیں جیسے دوسرے مختلف شعبوں کے کام !۔ اور بھرپور انقلاب جب آئے گا تو ہم نہیں جانتے کہ وہ کس شکل میں اور کس راستے سے آئے گا۔

ایک بہت بڑا اور اہم کام تحریک نے اپنے اوائل میں ہمارے سپرد کیا تھا جس کا عنوان تھا " علمی امامت " (یا فکری قیادت) ۔ تصور یہ دلایا گیا تھا کہ جب تک کوئی جماعت یا تحریک یا قوم علمی امامت کی باگ ڈور نہیں سنبھال لیتی اس کا ایک وقتی حکومت بنا لینا کوئی اہم کارنامہ نہیں ہے ۔ اصل بڑی قوت علمی امامت کی ہے جس کی باگ ڈور الحاد پسند مغربی دانشوروں کے ہاتھ میں ہے ۔ اس کے لیے تین سکیمیں تذ نظر تھیں ۔

اوّلاً یہ کہ تحقیقی کام شروع کیا جائے اور مختلف شعبہ ہائے علوم میں ملحدانہ اور مادہ پرستانہ نقطۂ نظر کے ابطال کے ساتھ ساتھ نئے خدا پرستانہ نظریات کی بنیادوں پر علوم اور تحقیقاتوں کو استوار کیا جائے۔ افسوس کہ عرصۂ رفتہ کے لحاظ سے بہت ہی حقیر پیمانے پر کام ہو سکا۔ مولینا مودودیؒ جہاں تک مختلف نظریات و مباحث کو اسلامی بنیادوں پر استوار کر گئے تھے اور جتنا کچھ تنقیدی شعور وہ مغرب کے جدید علوم کے متعلق دے گئے تھے، زیادہ تر اسی سرمائے کو کافی سمجھ کر کام چلایا گیا۔

غنیمت کہ لندن میں اسلامک فاؤنڈیشن، کراچی اور لاہور میں ادارہ ہائے معارف اسلامی، اسلام آباد میں انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، پشاور میں ریجنل اسٹڈیز[1] کا قیام عمل میں آیا جن میں ایک تو عربی یا انگریزی کتب کے تراجم شائع ہوئے، یا کچھ طبعزاد غیر تحقیقی چیزیں سامنے آئیں، بہت تھوڑی سی کتابیں تحقیقی نوعیت کی پیش ہو سکیں، ان میں سے بھی اول درجہ کی کتابیں چند ہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ابھی تک ہم نے فلسفہ و نفسیات، تاریخ، سوشیالوجی اور نظریۂ ارتقا جیسے مسائل پر اکا دکا معمولی مضامین کے سوا کوئی ایسا ٹھوس کام نہیں کیا کہ دنیا کا کوئی بھی شخص کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے اس سے بے نیاز ہو کر قابل اعتماد اور وقیع تحقیقی کام نہ کر سکے۔ ایسی صدہا کتب اور ان سے متعلق منعقد ہونے والے سیمیناروں اور کانفرنسوں اور مباحثوں اور مساعیٔ خط و کتابت (ملکی اور بین الاقوامی دائروں میں) اور تنقیدی اور وضاحتی مقالات کی عالمی جرائد میں اشاعت کا ایک لمبا سلسلہ آہستہ آہستہ علمی امامت کا رُخ ہماری طرف بدل سکتا ہے۔

مگر اس کا کوئی خاص اہتمام اور کوئی خاص تفکر ہمارے ہاں کبھی نہیں پایا گیا۔ لاہور کا ادارۂ معارف اسلامی قائم ہوا تو میری تجویز تھی کہ ہر شعبۂ کار میں علمی تحقیق کی تربیت و تیاری کے لیے دو دو، تین تین

---

[1] رابطۂ عالم اسلامی اور دنیائے اسلام کی علمی کونسلوں نے بھی اچھا خاصا کام کیا۔ غالباً رابطہ پیش پیش ہے۔ علاوہ ازیں خالص دینی موضوعات (تفسیر، حدیث، فقہ اور سیرت) پر ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد، اسلامی نظریاتی کونسل اور پاکستان اور دیگر اسلامی ممالک اور بھارتی مسلمانوں کی اقلیت کے اداروں نے بھی خدمات انجام دی ہیں۔ لیکن جو نظریات تہذیب الحاد کے ستون ہیں۔ ان کے متعلق وقیع کام کا خلا ہے۔

اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو مامور کیا جائے گا کہ نئی ٹیمیں تیار ہو کر کام کریں۔ مگر عملاً ہم کچھ نہیں کر سکے۔ نوجوانوں کو یہ ماحول یا تو دولت کی دوڑ میں لگا لیتا ہے یا وہ انتخابی لیڈری اور سیاسی عہدوں کی طرف لپکتے ہیں۔ پڑھنے لکھنے کے خاموش اور خشک کام کو جو گوشۂ تنہائی میں خونِ دل جلا جلا کر انجام پاتے ہیں۔ اُن کے لیے اس مطالعہ گریز معاشرے میں، ٹھوس علمی خدمات کی انجام دہی کے لیے جس قسم کے درویشانِ خدامست چاہییں وہ نایاب ہیں۔ بلکہ یونیورسٹیوں سے فارغ ہو کر نکلنے والوں کی اکثریت گہرے مطالعہ سے پورا پرہیز کر کے جعلی طریقوں سے امتحان پاس کرتی اور اپنی تعلیم یافتہ جہالت پر ڈگریوں کے سنہرے غلاف چڑھا لیتی ہے اور پھر ساری عمر اپنے آپ کو بھی اور دُنیا کو بھی یہ فریب دیتی رہتی ہے کہ ہم نے علوم و افکار کی بڑی اُونچی چوٹیاں سر کی ہیں۔

اِن ناگفتہ بہ حالات میں تحریکِ اسلامی کے متوسلین کی ذمہ داری تھی کہ وہ اپنی اولادوں، اپنے دوستوں اور رشتہ داروں، اور اپنے شاگردوں کے اندر سے محنت کر کے کچھ نوجوانوں کو ہر سال اُٹھاتے اور ان کے لیے وظائف کا انتظام بھی ہوتا۔ پھر وہ مختلف منصوبوں پر اداروں کے تحت اور بطور حقیقی تحقیقی کام کرتے۔ مگر ایک تو یہ سب کچھ ہوا ہی نہیں، دوسرے تحریک کے داخلی ماحول اور اس کی سرگرمیوں کے مطابق معیارِ پسندیدگی اور ترجیحاتِ رائجہ کے لحاظ سے مردانِ کار کی قدر و قیمت کا تعین کچھ اس طرح ہوتا رہا کہ سرے سے علمی و تحقیقی کام کی رغبت اور قدر پیدا نہ ہو سکی۔ رغبت صرف عہدوں کے لیے یا انتخابی اُمیدواری کے لیے ہے، یا پھر اسٹیج پر تقریری مہارت دکھانے کے لیے اور جلسوں جلوسوں اور مظاہروں اور نعرہ بازی کے لیے ہے۔ اندیشہ ہے کہ ایسی صورت میں ہماری مجالس میں، ہمارے داخلی انتخابات میں اور مجلسی اور سماجی اور محلہ داری کی زندگی میں "تعظیمِ ہنر" اور "تعظیمِ علم" کا بالکل قلع قمع ہی نہ ہو جائے۔ احتیاط!

اب انقلابِ امامتِ علمی کے سلسلے کی دوسری اسکیم کو لیجیے۔

اعلیٰ درجہ کی معیاری درس گاہ دیر تک ہمارا ایک اہم خواب بنی رہی۔ مگر وہ خواب آہستہ آہستہ بکھر گیا۔ اس کی ایک ہلکی سی، مگر اُمید افزا تعبیر منصورہ (حیدر آباد) میں نمودار ہوئی، مگر اس درس گاہ کو جس کی رُوحِ رواں پروفیسر سیّد محمد سلیم تھے، مارشل لا نے برباد کر دیا۔ اس کے بعد پھر آئندہ ایسے ہی کسی اندیشے کے پیشِ نظر اس رُخ پر کام بالکل بند ہو گیا۔ جیسے کوئی

خاندان کسی بچے کے شکارِ ظلم ہو جانے پر یہ فیصلہ کر لے کہ آئندہ کے لیے بچوں کی پرورش کا سلسلہ ہی ختم!

پھر اس سے نچلے درجے پر کوئٹہ، ملتان، اچھرہ اور دوسری جگہوں پر مروجہ نصابی نقشے پر کام کرنے والے ایسے اسکول نمودار ہوئے جن کا مقصد یہ تھا کہ اچھے اُستاد دورانِ نصاب اور اس کے متوازی کچھ ایسی چیزیں بھی سکھا دیں جو اسلامی ذہن بنانے والی ہوں اور ایسی عملی تربیت بھی دیتے رہیں جس سے کردار تعمیر ہوں۔ دوسری جگہوں کا مجھے علم نہیں مگر نیا مدرسہ اچھرہ کے بارے میں میں جانتا ہوں کہ قومیائے جانے سے پہلے کے دَور میں اُس نے ایسا معیار قائم کیا کہ محکمہ تعلیم کے بعض افسر کوشش کر کے اپنے بچے یہاں داخل کراتے تھے، نیز جو لوگ اُس دَور میں پڑھ کر نکلے وہ اب جہاں بھی کاروبار یا سرکاری ملازمتوں میں پائے جاتے ہیں اُن میں نئے مدرسے کی ایک خاص رُوح دَبی دبائی ملتی ہے۔

پھر ایک اسکیم تھی کہ کالجوں کے فارغ التحصیل نوجوانوں کو ایک سال یا دو سال ماہرین کی سرپرستی میں رکھ کر ان کے اندر دینی علم، عربی زبان اور تحریکی شعور اور ذوقِ تحقیق کی صلاحیتیں پیدا کر دی جائیں تاکہ وہ علمی تحقیق، تعلیم، علمی اداروں، پارلیمانی سیاست اور تحریکی قیادت کے لیے کار آمد بن سکیں۔ یا کم سے کم حکومت کے سِول یا فوجی عہدوں پر جا کر بہ احتیاط اپنے مقصد کی خدمت کر سکیں۔ یہ کام اگر ہو جاتا تو اگر فقط ۲۰ افراد سالانہ بھی ایسے میدان میں لا سکتا جو تحریک کی اوّل درجے کی ضرورتوں کو پورا کر سکتے تو آج لادینیت پسند دانشوروں کا یوں زور نہ بندھا ہوتا۔

ایرک سپریان سے ایک مرتبہ کسی نے کہا کہ تم حقیر سی تنخواہ پر اسلامیہ کالج میں پروفیسری کیوں کر رہے ہو (اُس زمانہ میں محکمہ تعلیم کی تنخواہوں کا معیار کم تھا اور پرائیویٹ اداروں کا اور بھی کم) تو مارکسی ذہن کے اُس فاضل اُستاد نے جواب دیا کہ میرے کام کا اتنا صلہ میرے لیے بہت ہے کہ میں ہر سال دو چار نوجوانوں کو ذہنی طور پر یہاں سے تیار کر کے معاشرے میں بھجوا تا ہوں۔ یہ ہوتی ہے انقلابی اسپرٹ۔ ہم ایسے مقصد کے لیے کوئی اچھا ادارہ نہ چلا سکے، بلکہ جب ہم بالکل تھک ہار گئے تو مولانا گلزار احمد مظاہری مرحوم نے علماء اکیڈمی قائم کی جہاں عربی مدارس سے تعلیم یافتہ نوجوان اور سرکاری کالجوں کے طلباء کے گروپس ہر سال کچھ مدت کے لیے یکجا رہ کر دونوں طرز کے اساتذہ کی رہنمائی میں تبادلۂ علوم کرتے ہیں۔ مگر ہمارا معیارِ مطلوب قدرے بلند تھا۔

دوسری جانب دیکھیں تو ہونے والے کاموں میں سے ایک تو وہ سلسلۂ ادارات ہے، جو دُنیا کی دولت مند ترین برادری ـــ اسماعیلیوں نے شروع کیا ہے۔ دوسری طرف حکیم محمد سعید بہت بڑا منصوبہ مدینۃ الحکمت کے عنوان سے شروع کر چکے ہیں، جس کی تفصیلات ہم سب کو جاننی چاہئیں اور اچھے سے اچھے لوگوں کو ایسی ملی خدمت میں حصّہ لینا چاہیے۔ تیسری طرف جناب طاہر القادری نے اچھے پیمانے اور قدرے جدید طرز کا دارالعلوم بھی شروع کیا ہے اور ساتھ ہی وہ ایک اعلیٰ درجے کے پبلک سکول کے قیام کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ہم کسی فرقہ وارانہ تنگ نظری سے کام لیے بغیر کام کرنے والے کے کام کی داد دیتے ہیں۔ دوسرے اعلیٰ مقاصد کو چھوڑ کر آپ صرف ایک اسی بات کو لیجیے کہ اس پبلک اسکول سے نکلے ہوئے ۵۰ افراد سالانہ (بدرجۂ اقل) اگر اگلی منازل کو طے کر کے بڑھیں اور ان کی نصف تعداد سرکاری عہدوں پہ قابض ہونے لگے تو چند سال بعد نتیجہ کیا ہوگا۔ دین کے لیے تو سب کی خدمات یکساں قابلِ قدر ہیں، مگر ایک خاص تحریکی اور انقلابی طرزِ فکر سے نوجوانوں کو آراستہ کرنے کا جو کام ہمارے ذمہ ہے، اُس کا کیا بنے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ہم دوسروں کے کام کے نتائج سامنے آنے کے بعد چونکیں اور ہاتھ پیر مار کر پھر کوئی کام کریں۔ مگر یہ پھر انقلابیوں والی بات تو نہ ہوئی، یہ تو وقت کی گاڑی آگے نکل جانے کے بعد اس کے پیچھے دوڑنا ہوا۔ پیچھے تو سبھی دوڑتے ہیں۔ سوال آگے نکلنے کا ہے۔ انقلابی قوت تو نئے نئے راستے نکالتی اور نئے نئے ادارے قائم کرتی ہے جنہیں دیکھ کر دوسرے پیچھے پیچھے دوڑتے ہیں۔ یہ بھی ایک طرز کی امامت ہے کہ کوئی ادارہ یا جماعت یا تحریک آگے آگے رہے۔

منصورہ میں، اور باہر متعدد دارالعلوم ہمارے ہیں اور ان کی ضرورت و اہمیت اپنی جگہ ہے مگر یہ صرف ایسے افراد تیار کرتے ہیں، جو مخصوص دائروں میں ذمہ داریاں سنبھالتے ہیں، بعض دوسرے دروازے ان پر بند ہیں۔ انجنیئر بننا، فوجی افسر ہونا، سول حلقوں میں کوئی مقام پانا، ان کاموں کے لیے ہمارے پاس کوئی تعلیمی ادارہ نہیں۔ اور نہ اُن کاموں کے لیے جن کا ذکر ہم نے شروع میں کیا ہے۔

سیّد مودودیؒ انسٹی ٹیوٹ بھی بڑا مبارک ادارہ ہے جو غیر ممالک کے بچوں کو خدمتِ اسلام کے لیے جدید خطوط پر ابتدائی مرحلے تک تیار کرتا ہے، مگر اس کے ہوتے ہوئے بھی وہ بڑا خلا باقی ہے جس کو

پُر کرنے کے لیے ایک تو معیاری درسگاہ درکار ہے وہ کتنی ہی محدود ہو یا معدود طلبہ کو جمع کر سکے ، کی اشد ضرورت ہے۔ دوسرے ایک پبلک سکول کی سی بعد میں اس طرز پر جا بجا کام کیے جا سکتے ہیں۔

ہمارے سامنے دیوبند اور سرسید کالج اور ندوہ کی مثالیں پہلے سے ہیں۔ حال ہی میں میری توجہ مدرستہ الاصلاح سرائے میر کے کام اور اثرات کی طرف منتقل ہوئی۔ بہت سے ایسے نوجوانوں کو میں جانتا ہوں جو مولانا حمید الدین فراہیؒ کے تفسیری مدرسۂ فکر کے نہایت پکے مرید و مقلد ہیں اور جہاں کہیں ہیں وہ علامہ فراہیؒ کا جھنڈا بلند کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی تفسیر سورۂ فیل کے سلسلۂ بحث میں نہایت ہی محترم بزرگ دوست مولانا صدر الدین اصلاحی کا ذکر ترجمان القرآن میں آچکا ہے۔ شرف الدین اصلاحی کا کام بھی میرے سامنے ہے ، دوسرے نوجوان جو لاہور میں فکرِ فراہی کی مشعل کو بلند کر رہے ہیں ، ان کی سرگرمی بھی معلوم ہے۔ رہے بڑے حضرت مولانا اصلاحی ، سو وہ تو ہم جیسوں کی حدِ نگاہ سے بھی آگے مقیم ہیں۔ لیکن اِدھر مجھے ایک مضمون نے بہت چونکا دیا۔ معارف میں ایک مضمون ستمبر ۸۸ء میں چھپا تھا۔ "علامہ شبلی کی تنقید نگاری (تفصیح و استدراک)" اس میں مطابق بحث ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب "مریخ" پٹنہ ، بھارت بابت ماہ ستمبر تا دسمبر ۱۹۸۸ء علامہ شبلیؒ کی پگڑی اُتار کر علامہ فراہیؒ کے سر باندھ دی گئی ہے۔ (اس کے محتاج فراہی نہیں ہیں) ۔ یہ مضمون ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی (مدینہ منورہ) نے لکھا اور اس کا جواب قاعدے کے مطابق معارف ہی کو بھیجا گیا ، مگر وہاں چونکہ ادارت مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے پاس ہے ، لہٰذا باوجود اصرار کے اس کی اشاعت میں لیت و لعل سے کام لیا گیا ، لہٰذا مجبوراً اسے مریخ میں شائع کیا گیا۔

مَیں اس بحث میں نہیں جاتا کہ کونسا فریق حق پر ہے ، کس پر الزام غلط ہے۔ میں تو صرف یہ توجہ دلا رہا ہوں کہ ایک درس گاہ کے پُرسکون کام کے نتیجے میں کس طرح صرف "اصلاحیت" اور "فراہیت" کا ایک فکری نظام زنجیری حلقوں کی طرح مختلف اداروں کے ذریعے اطراف میں آہستہ آہستہ کونپلیں نکال رہا ہے۔ یہ فکر کسی انقلاب کی محرک نہیں ، مگر عالمِ افکار میں اور خصوصاً دینی مباحث میں اس کا بھی ایک اثر ہے جو تھوڑا بہت بڑھ بھی سکتا ہے اور کسی جگہ جا کر رُک بھی سکتا ہے ، جیسے کہ مفسرین و محدثین کے مختلف نقطہ ہائے نظر ایک دور میں اُبھرے

اور پھر تہ نشین ہو گئے۔ خیر بحث اس سے نہیں۔ بحث اس سے ہے کہ اگر کسی انقلابی و تحریکی فکر کے ساتھ ہم لوگ اپنی درس گاہ قائم کر سکتے تو خواہ وہ کتنے ہی محدود پیمانے پر چلتی مگر ۲۰، ۳۰ سال کے عرصے میں وہ اپنے سینکڑوں فکری مشعل بردار معاشرے میں پھیلا سکتی۔

میرا خیال ہے کہ اب بھی وقت ہے کہ لادینیت کے خلاف ہمیں مضبوط تعلیمی محاذ ضرور قائم کرنا چاہیئے۔ اس موضوع پر اگر اپنے ہاں سے صرف تعلیمی ماہرین کا کوئی بورڈ یا کمیشن بٹھایا جائے کہ وہ انتظامی عہدہ داروں کے ذہنی دباؤ سے آزاد ہو کر ایسے کسی قابلِ عمل منصوبے (یا متعدد مختلف اسکیموں) کا نقشہ تیار کر دے تو پھر انتظامی قوتیں اس کو افرادی اور مالی وسائل کے لحاظ سے مناسب تدریج کے ساتھ چلا سکتی ہیں۔

وقت ہاتھ سے نکل جانے سے پہلے اپنی ذمہ داریوں کا حساب چکا دینا چاہیئے۔[1]

یہاں فی الحال میں اس طویل سلسلۂ بحث کو ختم کر رہا ہوں جو تین چار ماہ کے اشارات پر محیط ہو گیا ہے۔ اب آگے کچھ ایسے موضوع باقی ہیں جن کی طرف رُخ کرتے ہوئے پَر جلتے ہیں۔ لہٰذا کہنے کی کوئی اور بات نہیں ہے۔

---

[1] بحث اس سے نہیں کہ کب کیا فیصلہ ہوا اور کب کس طرح کا مشورہ ہوا یا موسسِ تحریک بھی اس کام کے تاخیر و التوا یا اس کے ترک کے ذمہ دار ہیں یا نہیں۔ نہ یہ باتیں کسی بھی دور کے کسی بھی ذمہ دار اصحاب پر کوئی ذمہ داری ڈالنے کے لیئے ہیں۔ بات تو صرف اتنی ہے کہ تحریک کے تقاضوں کے لحاظ سے ایک کام اشد ضروری تھا، اس میں تشکیل پاکستان کے سلسلے میں جو مصائب قوم کو پیش آئے وہ حائل ہوئے، پھر دستوری جد و جہد حائل ہوئی، پھر انتخابات حائل ہوئے اور ہمارے اندر یہ غلط تصور بھی ابھرا کہ شاید دو تین انتخابات کے بعد نظام میں اتنی تبدیلی آجائے کہ سرکاری یونیورسٹیوں کا ہی تعلیمی نقشہ بدل جائے۔ اور پھر ایک مارشل لا اور دوسرا اور تیسرا اور بیچ میں مارشل لا سے بھی سخت تر جمہوری فسطائیت۔ مگر ان سارے احوال کے باوجود تحریک کی ضرورتِ تعلیم گاہ ہم سے اپنی تکمیل کا تقاضا کر رہی ہے۔

تحریکِ اسلامی کا خلاصہ

دو کتابوں میں سمیٹ دیا گیا ھے !

① تحریکِ اسلامی کی پہلی کتاب

از : سیّد اسعد گیلانی

② تحریکِ اسلامی کی دُوسری کتاب

از : سیّد اسعد گیلانی

- پہلی کتاب : بارہ مضامین اور بیسیوں امتحانی تبلیغی سوالات پر مشتمل ہے ۔
- دوسری کتاب : تحریک کے دستور اور نصب العین سے لے کر تازہ ترین جدوجہد تک محیط ہے ۔
- پہلی کتاب : قاری کا ہاتھ پکڑ کر انفرادی تصورِ دین سے اجتماعی زندگی تک لے جاتی ہے ۔
- دوسری کتاب : اسلامی نظامِ جماعت کے ایک ایک جزو سے واقفیت فراہم کرتی ہے ۔
- پہلی کتاب : دین کا مشن اور مشن کے تقاضے بیان کرتی ہے ۔
- دوسری کتاب : تحریکِ اسلامی کی خصوصیات اور خصوصیات کے تقاضے بیان کرتی ہے ۔
- پہلی کتاب : ہر نئے متعارف ساتھی کے ہاتھ میں دیں ۔
- دوسری کتاب : ہر اس شخص کو دیں جس نے پہلی کتاب کا مطالعہ کر لیا ہے ۔

دونوں کتابیں تحریکِ اسلامی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں جو سمتِ منزل رواں دواں ہیں ۔

ان سے استفادہ کیجیے

پہلی کتاب : صفحات ۱۲۸ قیمت /۱۵ • دوسری کتاب : صفحات قیمت /۲۴

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار - لاہور

اسلامی نظریۂ ادب

کیا ہے؟

اس کے خدوخال کیا ہیں

اس کا حدود اربعہ کیا ہے

اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہیں:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی ● ڈاکٹر عماد الحق صدیقی

پروفیسر خورشید احمد ● جناب ماہر القادری

پروفیسر ہارون الرشید ● جناب آباد شاہ پوری

جناب نعیم صدیقی ● سید اسعد گیلانی

یہ نظریۂ ادب انقلابی نظریۂ توحید اور اخلاق پر قائم ہے۔

مرتب کرنے والے:

○ سید اسعد گیلانی

○ اختر حجازی

ضخامت: ۲۱۲ صفحات ○ قیمت: -/۳۰ روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار، لاہور